قرآن وسنت اور اسلاف امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

# مجلّہ صدائے حق بنگلور

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری زیدت معالیھم

استاذ حدیث ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر

عبدالرزاق بنگلوری

نائب مدیر

مفتی عبدالرحمٰن بنگلوری

ناشر

مجلس، صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور-78

قرآن وسنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا داعی

دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ

# صدائے حق بنگلور


| جلد:۰۲ | شمارہ:۱۵ | ماہ ستمبر ۲۰۲۲ء | ماہ صفر ۱۴۴۴ھ |
|---|---|---|---|



سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم

استاذِ حدیث و مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

| مدیر | نائب مدیر |
|---|---|
| عبدالرزاق بنگلوری | مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری |

**مجلس ادارت**

مفتی محمد علی صاحب قاسمی

مولانا محمد اُویس صاحب رشادی

مولانا عبداللطیف صاحب قاسمی

**مجلسِ مشاورت**

مولانا اشرف صاحب قاسمی

مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری

مفتی عبدالفتاح صاحب قاسمی

**ADVERTISEMENT TARIFF**

| | |
|---|---|
| Full Page (Title Back Cover) | 6000/- |
| Full Page (Title Inner Cover) | 5000/- |

**Black and White**

| | |
|---|---|
| Full Page (Inside Pages) | 2000/- |
| Half Page (Inside Pages) | 1000/- |
| Cuarter Page (Inside Pages) | 500/- |

**Phone Pe & Google Pay:7406464533**

مضمون نگار کی آرا سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں



**شائع کردہ**

**مجلس: صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور 78**

# فہرست مضامین


| عناوین | مضامین | اسمائے محررین | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| اداریہ | طوفانی بارشیں اور ہماری ذمہ داریاں | عبدالرزاق بنگلوری | ۳ |
| درسِ حدیث | اس امت کا خاص فتنہ مال ہے | مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری | ۶ |
| اصلاحِ معاشرہ | طاقت ور مؤمن (قسط اوّل) | مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی | ۱۱ |
| // // // | تربیتِ اولاد اہم ذمہ داری | مفتی محمد عفان صاحب منصور پوری | ۱۴ |
| // // // | علماء اور دینی خدام کا باہمی حسد (قسط دوم) | مفتی محمد اسجد صاحب ندوی قاسمی | ۳۱ |
| // // // | دینِ اسلام کی خوبی | مفتی محمد علی صاحب قاسمی | ۳۴ |
| // // // | امانت کی اہمیت اور حفاظت | مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی | ۳۸ |
| تذکرۂ اولیاء | راہِ عزیمت کے مسافر، مولانا ولی رحمانی صاحبؒ | مولانا عمرین محفوظ رحمانی صاحب | ۴۹ |
| // // // | ہمارے مخدوم جوارِ رحمت میں | مولانا محمد اویس صاحب رشادی | ۵۴ |
| // // // | رہ گئی تھی اِک شمع سو وہ بھی خموش | مولانا نجم الدین صاحب | ۶۱ |


## اطلاعِ عام

**نوٹ:** مضمون نگار اپنے مضامین مندرجہ ذیل ای میل (E-mail) یا واٹسیپ (WhatsApp) پر ان پیج (InPage) فائل روانہ کر سکتے ہیں، جزاکم اللہ خیراً وأحسن الجزاء.

**Email:** muftiabdurrahman57@gmail.com
**Whatsapp No:** 09620795460 - 9739349433

اداریہ

# طوفانی بارشیں اور مسلمانوں کی ذمہ داریاں

از: عبدالرزاق بنگلوری

اللہ تعالیٰ کائنات کے خالق ہیں اور اس کے نظام کو چلانے کے لیے مضبوط قوانین واٹل ضابطے مقرر فرمائے ہیں۔ کائنات کا نظام اس وقت تک صحیح چل سکتا ہے جب اللہ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چلایا جائے، اگر اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی کی جائے اور اللہ کے احکام کی نافرمانی کی جائے تو پھر نظام درست نہیں چلتا؛ بلکہ افراتفری، تباہی و بربادی اور مصائب وعذاب نازل ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں افراد، قومیں، قبیلے اور علاقے نیست ونابود ہوجاتے ہیں اور تباہی کے لیے یہی چیزیں (گناہ) باطنی اسباب کہلاتے ہیں، قرآنِ کریم میں نافرمانوں پر عذاب کا تذکرہ بہ کثرت موجود ہے۔

ابلیس نے اللہ کی نافرمانی کی، تباہ ہوا۔ قابیل نے اللہ کی نافرمانی کی، تباہ ہوا۔ قومِ نوحؑ نے اللہ کی نافرمانی کی طوفان کے عذاب میں مبتلا ہوئی، تباہ ہوئی۔ قومِ عادؑ نے اللہ کی نافرمانی کی، تیز ہوا کے عذاب میں مبتلا ہوئی، تباہ ہوئی۔ قومِ ثمودؑ نے اللہ کی نافرمانی کی، چیخ کے عذاب میں مبتلا ہوئی، تباہ ہوئی۔ قومِ لوطؑ نے اللہ کی نافرمانی کی، پانی میں غرق اور پتھروں کے عذاب میں مبتلا ہوئی، تباہ ہوئی۔ نمرود نے اللہ کی نافرمانی کی، مچھر کے عذاب میں مبتلا ہوا، تباہ ہوا۔ فرعون نے اللہ کی نافرمانی کی، بحرِ قلزم میں غرق ہوا، تباہ ہوا۔ قارون نے اللہ کی نافرمانی کی، زمین میں دھنسنے کے عذاب میں مبتلا ہوا، تباہ ہوا۔ بنی اسرائیل نے اللہ کی نافرمانی کی، ظالم بادشاہ کے مظالم کا شکار ہوئی، تباہ ہوئی۔

قرآنِ کریم میں ہے کہ بر و بحر میں ہونے والا فساد لوگوں کے اپنے کرتوتوں کا ہی کیا دھرا ہے اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اور جو مصیبت و پریشانی تمہیں آتی ہے یہ تمہارے ہی گناہوں کا نتیجہ ہوتی ہے، جبکہ اکثر جرائم سے اللہ درگزر بھی فرمادیتا ہے، ہر آنے والی مصیبت ہمیشہ عذاب ہی نہیں ہوتی، بعض مرتبہ آزمائش کے طور پر بھی آتی ہیں، ایسے وقت میں توبہ واستغفار اور اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

قرآنِ کریم میں ہے: کیا وہ لوگ اس بات میں غور نہیں کرتے کہ ہر سال ایک یا دو بار مصائب کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا کیے جاتے ہیں، اس کے باوجود بھی وہ اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے اور نہ ہی اس سے سبق

سیکھتے ہیں۔(سورۃ التوبہ) بارش کی وجہ سے زمینیں سیراب ہوتی ہیں، کھیتیاں، باغات، نہریں اور موسم معتدل ہوتا ہے، اگر بالکل بارش نہ ہوتو پانی کی تہہ نیچے چلی جائے اور اگر بارشیں مسلسل برسنا شروع کردیں تو طوفان اور سیلاب کا خطرہ ہوتا ہے۔

## اپنی ذمہ داری:

ہر حال میں صبر واستقامت، دین سے وابستگی اور تسلیم ورضا اہلِ ایمان کی علامت اور بندگانِ خدا کی بنیادی نشانی ہے، صبر وشکر ہی بندۂ مؤمن کا وہ ہتھیار ہے، جسے وہ ہمیشہ تھامے رکھتا ہے، تقدیر کے فیصلوں پر راضی رہنا، اُنھیں تسلیم کرنا اور صبر واستقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا، اہلِ ایمان کا شِعار ہے۔ وہ آزمائش کی ہر گھڑی اور امتحان میں اللہ سے اپنے تعلق کو اُستوار رکھتے ہیں۔ اُسی سے اپنی اُمیدیں وابستہ کرتے اور اُسی سے لَو لگاتے ہیں۔

بیش تر مواقع پر قدرتی آفات اور آسمانی مصائب اللہ کی طرف سے مقرر کردہ طرزِ زندگی سے انحراف، سرکشی اور بغاوت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ درحقیقت اللہ کی جانب سے انتباہ اور یاددہانی ہوتے ہیں کہ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی اور اُس کی نافرمانی چھوڑ کر اللہ کے دامنِ رحمت میں پناہ تلاش کی جائے۔ ''سورۂ توبہ'' میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم اُنھیں سال میں ایک دومرتبہ کسی نہ کسی آزمائش میں مبتلا کردیتے ہیں، کیا یہ یاددہانی بھی انھیں اس بات پر آمادہ نہیں کرتی کہ اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور نصیحت پکڑیں''۔ (سورۃ التوبہ:۱۲۶)

ہمیں یہ حکم ہے کہ اللہ کی رحمت سے کسی صورت اور کبھی بھی مایوس نہ ہوں، اُس کے دامنِ رحمت سے وابستہ رہنے، دین پر عمل کرنے، عبرت ونصیحت حاصل کرنے میں ہی عافیت ہے۔ اللہ کی رحمت کا دامن جس قدر وسیع ہے، اُس کے عفوو کرم اور درگزر کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی رحمت سے مایوس ہوجانے والوں سے بھی ناراضی کا اظہار فرماتا ہے، اس حوالے سے ارشاد ہوا: ''اللہ کی رحمت سے صرف گُم راہ ہی مایوس ہوسکتے ہیں''۔ (سورۃ الحجر:۵۶)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیثِ قدسی میں بیان فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بندہ میرا قرب حاصل کرنے کے لیے اور میری اطاعت وفرماں برداری کی راہ میں میری طرف بالشت بھر آگے بڑھتا ہے، میں اُس کی طرف ہاتھ بھر بڑھتا ہوں، اور جو میری طرف ہاتھ بھر آگے بڑھتا ہے، میں گز بھر اُس کی طرف بڑھتا ہوں، اگر میرا بندہ چلتا ہوا میری طرف آئے تو میں دوڑتا ہوا اُس کی جانب بڑھتا ہوں''۔ ارشادِ نبویؐ کے مطابق گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے، گویا اُس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ (سنن ابنِ ماجہ)

دوسری طرف ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہم محسنِ انسانیت، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت وشفقت، ایثار و ہمدردی کے پیکر تھے، انسانیت کی خدمت، اُس کی فلاح، اسے دین کی راہ پر گامزن کرنا، توحید کے نُور سے منور کرنا اور خدمتِ خلق کا جذبہ دل میں ہمیشہ موجزن رکھنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ اور سیرتِ طیبہ کا امتیازی پہلو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک روشن باب ہے۔

مشکل کی اس گھڑی، آزمائش کے اس لمحے اور قومی وملّی زندگی کے اس موڑ پر ہمیں یک قلب اور یک جان ہوکر اپنے ہم وطن سیلاب زدگان بزرگوں، ماؤں، بہنوں، بھائیوں، معصوم بچوں، بے سہارا افراد اور دیگر متاثرین کو یاد رکھنا چاہیے، بڑھ چڑھ کر اور دل کھول کر ان کی ہر ممکن مدد کرنی چاہیے۔ یہ خدمتِ خلق اور انفاق فی سبیل اللہ کا اہم مصرف ہے، ان کی بڑھ چڑھ کر مدد کرنا ہمارا دینی، ملی اور قومی فریضہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے، جو اُس کے کنبے سے اچھا سلوک کرتا ہے''۔ (مشکوٰۃ، باب الشفقة والرحمة علی الخلق)

ایثار و ہمدردی، باہم اخوت ومحبت، انفاق فی سبیل اللہ سے متعلق اسلام کی یہ سنہری تعلیمات ہمیں اِس بات پر آمادی کرتی ہیں کہ ہم حالیہ سیلاب کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں ملک وقوم کو پہنچنے والی مشکل اور آزمائش کی اس گھڑی میں سیلاب متاثرین کی ہر طرح مدد کریں، اس موقع پر خدمتِ خلق، فلاحِ انسانیت، ایثار و ہمدردی کے اُن جذبات کا مظاہرہ کریں، جو ہمارے دین کا شعار اور ہماری دینی، ملّی اور تہذیبی اقدار کی روح ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر مصیبت و پریشانی سے نجات عطا فرمائے، آمین۔

❑❖❑

درسِ حدیث

# اس امت کا خاص فتنہ مال ہے

ازقلم: مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری، ناظم مدرسہ دارالتوحید، اعلیٰ ہلی بنگلور

عَنْ كَعْبِ بْنِ عِيَاضٍ، قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: "إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةً، وَفِتْنَةُ أُمَّتِي الْمَالُ". (ترمذی:٥٩/٢)

''کعب بن عیاض کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ (حق تعالیٰ کی طرف سے) ہر اُمت کے لیے (کوئی نہ کوئی) فتنہ وآزمائش ہے (جس میں اس امت کے لوگوں کو مبتلا کر کے اُن کو آزمایا جاتا ہے)؛ چنانچہ میری امت کے لیے جو چیز فتنہ وآزمائش ہے وہ مال ودولت ہے (یعنی اللہ تعالیٰ میری اُمت کے لوگوں کو مال ودولت دے کر یہ آزمانا چاہتا ہے کہ وہ راہِ مستقیم اور حدِّ اعتدال پر قائم رہتے ہیں یا نہیں)''۔

## مال کی زیادتی عام طور پر کبر پیدا کرتی ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں قارون کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، قارون کہتا تھا کہ یہ مال ودولت میری ہنرمندی کی وجہ سے ملا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اور اس کے مال کو ہلاک وبرباد کر دیا، ملاحظہ ہو:

﴿قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّأَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ○.

(پ:٢٠، سورۃ القصص، رقم الآیۃ:٧٨، رکوع:٨)

بولا یہ مال تو مجھ کو ملا ہے ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے (یعنی میں ہنرمند تھا، کمانے کا سلیقہ رکھتا تھا، اپنی لیاقت وقابلیت یا کسی خاص علمی مہارت سے مجھے یہ دولت حاصل ہوئی۔ اللہ نے بھی میری لیاقت کو دیکھ کر اور قابل جان کر یہ کچھ دیا ہے۔ کیا یوں ہی نہیں بیٹھے بٹھائے بے محنت مل گیا ہے کہ موسیٰ کے حکم اور تمہارے مشورہ کے موافق خدا کے نام پر خرچ کر ڈالوں) کیا اُس نے یہ نہ جانا کہ اللہ غارت کر چکا ہے اس سے پہلے کتنی جماعتیں جو اُس سے زیادہ رکھتی تھیں زور اور زیادہ رکھتی تھیں مال کی جمع (یعنی دولت کمانے کی لیاقت کس نے دی، افسوس ہے مُنعِمِ حقیقی کو بھول کر اُس کی دی ہوئی دولت ولیاقت پر غرّہ کرنے لگا، کیا اِسی دولت کو اُس نے اپنی نجات کا ضامن تصور کر رکھا ہے، اُسے معلوم نہیں کتنی جماعتیں اپنی شرارت وسرکشی کی بدولت پہلے تباہ کی جا چکی ہیں، جن کے پاس بادشاہتیں تھیں اور اس ملعون سے

زیادہ خزانوں اور لشکروں مالک تھے، اُن کا انجام سُن کر اسے عبرت نہ ہوئی۔) اور پوچھے نہ جائیں گنہگاروں سے اُن کے گناہ (یعنی پوچھنے کی ضرورت کیا ہوگی۔ اللہ کو اُن کے گناہ ایک ایک کر کے معلوم ہیں، فرشتوں کے یہاں سب لکھے ہوئے ہیں، ہاں! بطور توبیخ وتفریع اگر کسی وقت سوال ہو وہ دوسری بات ہے، یا یہ کنایہ ہے گناہ کی کثرت سے۔ یعنی اتنی تعداد میں ہوں گے کہ ایک ایک جزئی کی پوچھ پاچھ کی ضرورت نہ رہے گی۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''پوچھے نہ جائیں گے گناہ، یعنی گناہگار کی سمجھ درست ہو تو گناہ کیوں کرے، جب سمجھ اُلٹی پڑے تو الزام دینے سے کیا فائدہ کہ یہ بُرا کام کیوں کرتا ہے اس کی بُرائی نہیں سمجھتا'')۔ (ماخوذ از ترجمہ شیخ الہند مع فوائد عثمانی)

اس واقعہ سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ قارون جیسا امیر کسی طرح مال ودولت کے گھمنڈ میں مبتلا ہو کر گمراہ ہوا اور کس طرح نشانِ عبرت بنا، عام طور پر مال ودولت آدمی میں خرابیاں، عدمِ محبت، تکبر جیسی بیماریاں پیدا کر دیتا ہے، اسی وجہ سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ تاکید ارشاد فرمایا: ''کہ ہر امت کو گمراہ ہونے کے لیے کوئی نہ کوئی فتنہ وآزمائش ہوتی ہے اور میری امت مال ودولت کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہوگی''، بیک وقت مال ودولت بھی ہو اور مال کے فتنوں سے محفوظ ہو ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے؛ اِسی لیے اس کو سمجھنے کے لیے ایک آسان اور عام فہم مثال خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادی۔

## دنیاداری سے اجتناب کرو:

ایک روایت میں آتا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک دن، مجلس نبویؐ میں موجود صحابہؓ سے) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، کیا کوئی شخص پانی پر اِس طرح چل سکتا ہے کہ اس کے پاؤں تَر (بھیگے) نہ ہوں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ایسا تو ممکن نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہی حال دنیادار کا ہے کہ وہ گناہوں سے محفوظ وسلامت نہیں رہتا''۔

## تشریح:

اس ارشادِ گرامی کا حاصل مالداروں اور دولتمندوں کو سخت خوف دلانا اور دنیا سے زہد اختیار کرنے کی ترغیب ہے، اسی طرح اس بات کو واضح کرنا مقصود ہے کہ ہر حالت میں آخرت کے نفع ونقصان کو دنیا کے نفع ونقصان پر ترجیح دینا چاہیے، دنیاوی مالداروں اور دولتمندوں کو یہی احساس کافی ہونا چاہیے کہ آخرت کا نقصان وخسران فقر کی بہ نسبت مالداری میں زیادہ پوشیدہ ہے اور فقر کی یہی فضیلت کیا کم ہے کہ فقراء (جنھوں نے اپنے فقر وافلاس پر صبر وقناعت اختیار کیا ہوگا) جنت میں مالداروں سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے۔

## مال واولاد آزمائش بھی ہیں اور ذریعۂ نجات بھی:

مال کا صحیح استعمال اور اولاد کی صحیح تربیت آدمی کو نجات دلاسکتی ہے؛ اِسی لیے حدیث میں نیک صالح اولاد کو صدقۂ جاریہ کے درجے میں فرمایا گیا ہے اور مال کے بارے میں فرمایا جو خالصتاً لوجہ اللہ مال کے حقوق ادا کرتا ہے وہ اس مال والے کے لیے بہترین چیز ہے، اس کے بالمقابل اگر کسی نے مال کا استعمال صحیح نہیں کیا اور اولاد کی صحیح تربیت نہیں کی تو یہی مصیبت وآزمائش ہے؛ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ — تمہارے مال اور تمہاری اولاد یہی ہیں جانچنے کو اور اللہ جو ہے اُس کے پاس ہے ثواب بڑا۔

(پ:۲۸، رقم الآیة:۱۵، سورۂ تغابن، رکوع:۲) (ترجمہ شیخ الہندؒ)

## تشریح:

یعنی اللہ تعالیٰ مال واولاد دے کر تم کو جانچتا ہے کہ کون ان فانی وزائل چیزوں میں پھنس کر آخرت کی باقی ودائم نعمتوں کو فراموش کرتا ہے اور کس نے ان سامانوں کو اپنی آخرت کا ذخیرہ بنایا ہے اور وہاں کے اجرِ عظیم کو یہاں کے حظوظ ومالوفات پر ترجیح دی ہے۔ (ماخوذ از فوائدِ عثمانیؒ)

## حقیقتِ دنیا:

دنیا اور دنیا کے مال ودولت اور یہاں کی چیزوں کی حقیقت کو بہت ہی بہترین اور مختصر انداز میں رب ذوالجلال نے تعبیر کیا ہے، فرمایا:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾. — اور نہیں زندگانی دنیا کی مگر پونجی دھوکے کی۔

(پ:٤، سورۂ آلِ عمران، رقم الآیة:۸۵، رکوع:۱۹) (ترجمہ شیخ الہندؒ)

## تشریح:

یعنی دنیا کی عارضی بہار اور ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت دھوکہ میں ڈالنے والی چیز ہے، جس پر مفتون ہوکر اکثر بے وقوف آخرت سے غافل ہوجاتے ہیں؛ حالانکہ انسان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ یہاں رہ کر انجام کو سوچے اور وہ کام کرے جو عذابِ الٰہی سے بچانے والا اور جنت تک پہنچانے والا ہو۔ (ماخوذ از فوائدِ عثمانیؒ)

عقلمند آدمی کو چاہیے کہ وہ دنیاوی مال ودولت سے آزمائش میں مبتلا نہ ہو، اور آخرت سے غافل نہ ہو، اس

دنیاوی مال ودولت کو اللہ کی طاعات اور نیک کاموں میں خرچ کرے، مال ودولت اور اس کو بڑھانے کی دُھن ہمیشہ سوار نہ ہو؛ بلکہ آخرت میں کامیابیوں کے حصول کے لیے استعمال کرے اور حتی المقدور کوشش کرے کہ یہ مال ہمیں آخرت اور خدا سے غافل نہ کردے، اگر مال کی وجہ سے ہم آخرت سے غافل ہوگئے اور اللہ کو بھول گئے تو یہی مال وبالِ جان بنے گا۔ (الامان الحفیظ)

## مال کی کمی، درحقیقت بڑی نعمت ہے!

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ''دو چیزیں ایسی ہیں جن کو آدم (انسان) ناپسند کرتا ہے (اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ دونوں چیزیں بہت اچھی ہیں) چنانچہ انسان ایک تو موت کو ناپسند کرتا ہے؛ حالانکہ مؤمن کے لیے موت فتنہ سے بہتر ہے، دوسرے مال ودولت کی کمی کو ناپسند کرتا ہے؛ حالانکہ مال کی کمی حساب کی کمی کا موجب ہے''۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ نے اس موقع پر بڑی حکمت آمیز بات کہی ہے، انہوں نے ہر طالبِ حق کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''عزیزمن! یہ سب ایمان کی شاخیں ہیں، جو شخص شارع علیہ السلام کے ارشادات کے مطابق ایمان کو صحیح ودرست رکھتا ہے وہ یقیناً جانتا ہے کہ شارع علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا ہے وہ برحق اور عین صداقت ہے، اور اگر وہ شخص عقلِ سلیم اور صحیح تجربہ رکھتا ہو تو وہ اسی دنیا میں بھی جان لیتا ہے کہ مال ودولت کی فراوانی اور اس مال ودولت کو حاصل کرنے اور جمع کرنے؛ نیز اس کے ساتھ تعلق ومحبت رکھنے کے سلسلے میں جن مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس قدر ذلت وخواری کا منھ دیکھنا پڑتا ہے، اور جتنی زیادہ محنت اور مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے، وہ سب فقر وافلاس کی سختیوں اور پریشانیوں سے کسی طرح کم نہیں! پس (دنیاوی طور پر محنت ومشقت اور ہر طرح کی ذلت وخواری سے بچنے ہی کا نہیں؛ بلکہ) نفس کی پاکیزگی وصفائی (اور اُخروی حساب وعذاب سے بچنے؛ نیز درجات کی بلندی ورفعت) کا انحصار اِس بات پر ہے کہ مال ودولت کی کثرت سے اپنا دامن بچایا جائے، اس سے قطع تعلق کرکے اور قدرِ کفایت پر قناعت کرکے عزتِ نفس اور اخلاق وکردار کی بلندی واستقامت کو اختیار کیا جائے''۔

ایک حدیث میں آیا ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ دنیا میں آدمی (کی ملکی) تین چیزوں ہی کی ہے: (۱) وہ مکان جس میں رہتا ہو (۲) وہ کپڑا جس سے اپنا ستر چھپائے (۳) پانی اور روٹی کا ٹکڑا، یعنی کھانا پینا اور کپڑا بقدرِ ضرورت کا محتاج ہے، ان چیزوں میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں ہے، رہا کاروبار اور تجارت ایسی ہو جو آخرت سے مشغول نہ کرے جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور نیک لوگوں نے انجام دی، ان کی تجارت اللہ

کی یاد، نماز کے قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے مانع نہیں تھی، صحابہ رضی اللہ عنہم دنیاداری میں بھی اللہ سے اور آخرت سے غافل نہیں ہوتے تھے، جبکہ ہم مسجد میں اللہ سے غافل اور آخرت کو بھول جاتے ہیں۔

## مال کمانے میں سبقت موجبِ ہلاکت ہوسکتی ہے!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو بھی موجبِ فتنہ فرمایا ہے، ارشاد فرمایا: ''میرے بعد مَردوں کے لیے عورتوں سے زیادہ نقصان دہ فتنہ کوئی نہیں ہے''، اسی طرح اور بھی کئی اشیاء کو فتنہ قرار دیا ہے؛ لیکن مال کے فتنے کو اس امت کے خاص فتنوں میں شمار کیا ہے اسی وجہ سے یعنی مال کے فتنہ میں پڑنے کی وجہ ہلاکت بھی ہوسکتی ہے، ارشادِ نبویؐ ہے: ''قسم بخدا! میرے بعد تم سے شرکت کا خوف مجھ کو نہیں ہے (یعنی میرے دنیا سے جانے کے بعد تم دین سے پھر جاؤں گے اور مشرک ہوجاؤں گے)؛ لیکن تم سے (جس بات کا) خوف ہے وہ یہ ہے کہ تم دنیا کے کمانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ (اور حلال وحرام اور حقوق کی پرواہ نہ کرو) اور اسی طرح ہلاک ہوجاؤ جس طرح تم سے پہلی امتیں دنیا کمانے میں سبقت کی وجہ سے ہلاک برباد ہوگئیں''۔

تو آپ علیہ السلام نے اس بات سے خبردار اور متنبہ کردیا مال اور دنیا میں بیجا اور ضرورت سے زیادہ انہماک موجبِ ہلاکت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہماری اور سارے ہی انسانوں کی مال کے فتنے سے حفاظت فرمائے، آمین۔

اصلاحِ معاشرہ (قسط اوّل)

# طاقت ور مؤمن

ازقلم: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، ترجمان وسکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: طاقت ور مؤمن کمزور مؤمن سے بہتر ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر:۲۶۶۴) عام طور پر ہمارے معاشرہ میں جب طاقت کا ذکر کیا جاتا ہے تو لوگ اِس سے جسمانی طاقت مراد لیتے ہیں؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو اِس کا مفہوم اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے، طاقت ایک وصف ہے اور انسان کی مختلف صلاحیتیں اِس وصف کی حامل ہوسکتی ہیں، مثلاً طاقت؛ اخلاق وکردار کی بھی ہوتی ہے اور بعض دفعہ اخلاق وکردار کی طاقت سے وہ کام لیا جاتا ہے جو ہاتھ پاؤں کی طاقت سے نہیں لیا جاسکتا، جسمانی طاقت سے تو زروزمین کو فتح کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اخلاق کی طاقت سے انسان کے دل جیتے جاتے ہیں، اسی طرح طاقت دولت وثروت کی بھی ہوتی ہے، ایک جسمانی اعتبار سے کمزور شخص بھی مال ودولت کے ذریعے بڑے بڑے معرکوں کو جیت سکتا ہے، ایک بہت بڑی طاقت وہ ہے جو سیاست کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، سیاسی طاقت کے ذریعہ افراد اور قومیں ملک وقوم کی تقدیر کی مالک ہوجاتی ہیں، طاقت علم، ٹکنالوجی اور زبان وقلم کی بھی ہوتی ہے، ایک صاحبِ علم شخص اگرچہ کہ وہ نحیف الجثہ ہو؛ لیکن وہ اچھے خاصے ڈیل ڈول والے انسان پر بھی تفوّق حاصل کرلیتا ہے، یہی سب سے بڑی طاقت ہے، ایک صاحبِ علم شخص ایک ہزار ناتعلیم یافتہ افراد پر بھاری ہوتا ہے، ایک ایسی قوم جو علم وفن سے بہرہ ور ہو، اگرچہ وہ تعداد کے اعتبار سے چھوٹی اقلیت ہو؛ لیکن وہ ایسی قوموں پر بھاری ہوجاتی ہے، جو تعداد کی کثرت کے اعتبار سے ریگستان کے ذرّات سے بھی بڑھی ہوئی ہو؛ مگر علم سے تہی دست اور فکر ونظر کے سرمایہ سے تہی دامن ہو، دنیا میں اِس کی بہت سی مثالیں ہیں، جن کو سَر کی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے اور جن کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر اپنی عظمت کے نقوش ثبت کیے ہوئے ہیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ ہم برطانیہ کے غلام تھے، جو انگریز برطانیہ سے ہندوستان آئے، ہندوستان کے اصل باشندوں کے مقابلے میں اُن کی تعداد اتنی کم تھی کہ شاید آٹے میں نمک کا تناسب بھی اُس سے زیادہ ہوتا؛ لیکن یہ وہ دَور تھا جب مشرق سے مغرب تک برطانیہ کے اقتدار کا آفتاب عالم تاب روشن تھا، کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کی سلطنت میں سورج کے غروب ہونے کی نوبت نہیں آتی تھی، اگر مغرب میں امریکہ اور کینیڈا تک

برطانیہ نے حکومت کی ہے، تو مشرق میں مشرق بعید کے ممالک بھی اُس کی غلامی کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے رہے ہیں؛ حالاں کہ برطانیہ کے باشندے نہ صرف تعداد کے اعتبار سے بہت کم تھے؛ بلکہ اصل مملکت برطانیہ کا رقبہ بھی اتنا محدود تھا کہ ہندوستان کا چھوٹے سے چھوٹا صوبہ بھی اپنے رقبے میں اُس سے بڑھا ہوا ہوگا، مجھے جب برطانیہ جانے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ برطانیہ کے ایک طرف سے دوسرے طرف کا فاصلہ صرف چھ سو میل یا اُس سے کچھ زیادہ ہے، یہ کس طاقت کا اثر تھا؟ یہ جسمانی طاقت یا عددی طاقت کا نتیجہ نہیں تھا، یہ علم اور ٹکنالوجی کی طاقت کا نتیجہ تھا، خود جاپان کو دیکھیے کہ ایک چھوٹا سا اور چند جزیروں پر مشتمل ملک ہے؛ لیکن اُس کی ٹکنالوجی کی طاقت کا کرشمہ ہے کہ پوری دنیا اُس کے سامنے سَر جھکاتی ہے، اگر ایک ہی شئے جاپان کی بنائی ہوئی ہو اور کسی دوسرے ملک کی بھی، تو خریدار تفصیلات معلوم کیے بغیر بلا تکلف خیال کرتا ہے کہ جاپان کی بنائی ہوئی شئے مہنگی تو ہوسکتی ہے؛ لیکن معیار کے اعتبار سے وہی فائق ہوگی، یہ علم اور ٹکنالوجی کی طاقت کا اثر ہے۔

اگر اِس پس منظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو سمجھا جائے تو مؤمن کے قوی ہونے کا مفہوم بہت وسیع ہوجاتا ہے اور اس وسعت میں یہ بات شامل ہے کہ جو مؤمن علم کی طاقت سے آراستہ ہو، اور تعلیم یافتہ ہو، وہ ایسے مسلمان سے بہتر ہے جس نے جہالت پر قطاعت کر رکھا ہو، جو علم کی روشنی سے محروم ہو، غالباً اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے مؤمن کو پسند فرماتے ہیں جو حرفت سے واقف ہو اور ٹکنالوجی سے آگاہ ہو: ''إن اللّٰہ یحبّ المؤمن المحترف''. (المعجم الاوسط، حدیث نمبر: ۸۹۳۴) کیوں کہ جو قوم علوم وفنون کی حامل ہوتی ہے، جو قوم صنعت وٹکنالوجی کی دولت رکھتی ہے، دنیا کو اُس کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اپنی صلاحیت کے ذریعے سربلندی وسرفرازی حاصل کرتی ہے، یہودیوں کی تعداد کتنی کم ہے؟ امریکہ جیسے ملک میں اُن کی تعداد پانچ فیصد سے بھی کم ہے؛ لیکن ذرائع ابلاغ جیسا مؤثر وسیلہ پوری طرح اُن کے ہاتھوں میں ہے، بینکنگ کا نظام صد فیصد اُن کی گرفت میں ہے؛ اِسی لیے کسی امریکی صدر کی مجال نہیں کہ وہ یہودیوں پر کھل کر تنقید کرے اور جن لوگوں نے دبے لفظوں میں تنقید کی، اُن کو ناکوں چنے چبوا دیے گئے، یہ سب تعلیم کا کرشمہ ہے؛ اِسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ نوبل انعام پانے والوں میں اکثریت یہودیوں کی ہے، خود ہم اپنے ملک میں برہمنوں کو دیکھ سکتے ہیں، برہمنوں کی تعداد تین چار فیصد سے زیادہ نہیں؛ لیکن عملاً پورے ملک کا اقتدار اُن کے ہاتھوں میں ہے، وہی سیاسی طالع آزماؤں کی جیت وہار کا فیصلہ کرتے ہیں اور ملک کی داخلہ وخارجہ پالیسی مرتب کرتے ہیں، یہ نتیجہ ہے اُن کی تعلیمی جدوجہد اور اِس میدان میں انتھک کوششوں کا، اس کا اثر ہے کہ اس ملک کے ساٹھ فیصد سے زیادہ کلیدی عہدوں پر برہمن یا ہندستان کی اُونچی ذاتوں کے لوگ مسلط ہیں؛

اِس لیے ہمیں ایک ایسی اُمت بننا چاہیے جو علم کے زیور سے آراستہ اور صنعت وٹکنالوجی کی صلاحیت سے مالا مال ہو؛ تاکہ ہمارا ہاتھ اُونچا ہاتھ رہے، ہم اس لائق ہوں کہ ملک کو کچھ دے سکیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: اُونچا ہاتھ نیچے ہاتھ سے بہتر ہے: "**الید العلیا خیر من الید السفلٰی**". (صحیح بخاری، حدیث نمبر:۱۴۷۲) یعنی جو فرد دینے والا ہاتھ رکھتا ہو وہ اُس فرد سے بہتر ہے جس کے پاس صرف لینے والا ہاتھ ہو، جس قوم کے پاس لوگوں کو دینے کی صلاحیت ہو، وہ اُس قوم سے بہتر ہے جس کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی ہو اور وہ دوسری قوموں سے پیسوں کی، عزت ووقار کی، ملازمتوں کی، معاشی مدد کی اور سیاسی عہدوں کی بھیک مانگتی رہے۔

ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے پیغمبر! آپ فرمادیجیے کہ جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو لوگ علم سے محروم ہیں کیا وہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ نصیحت وعبرت تو وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہوں: ﴿**قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ، اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ**﴾ (الزمر:۹) یہ آیت اگرچہ ایک خاص پس منظر میں نازل ہوئی ہے؛ لیکن اس میں دو باتوں کی طرف واضح اشارہ موجود ہے، ایک یہ کہ علم والے اور بے علم، تعلیم یافتہ اور جاہل دونوں برابر نہیں ہیں، دوسرے یہ کہ وقت اور حالات کا تجزیہ کرنا، اُس سے عبرت ونصیحت حاصل کرنا یہ اُن ہی لوگوں کا کام ہے جو عقل وفہم رکھتے ہوں اور جنھوں نے علمی کاوشوں کے ذریعے اپنی فہم وبصیرت میں اضافہ کیا ہو، یہ اہلِ علم اور علم سے محروم لوگوں کے درمیان نابرابری صرف آخرت میں ہی ظاہر نہیں ہوگی؛ بلکہ دنیا میں شب وروم اس کی مثالیں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں، تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان ہر میدان میں فرق پایا جاتا ہے، ایک تعلیم یافتہ قوم سیاسی نظام میں جو حصہ داری حاصل کرسکتی ہے، علم سے تہی دامن قوم کبھی وہ اثر ورسوخ حاصل نہیں کرسکتی، جو گروہ علم سے آراستہ ہو وہ میدانِ جنگ میں علم سے محروم قوم کو شکست دے سکتا ہے، وہ معیشت کے میدان میں بھی عزت وسربلندی حاصل کرتا ہے، اور جو قومیں علم سے محروم ہوتی ہیں، ذلت ورسوائی، غربت وافلاس اور پسماندگی اُن کا مقدر بن جاتا ہے، جو گروہ تعلیم یافتہ اور صاحبِ علم ہوتا ہے، وہ حکومت کے کلیدی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتا ہے، اُس کی ہر بات کان لگالگا کر سُنی جاتی ہے، اور جو گروہ جہالت کے دلدل میں پھنسا ہوا ہو وہ چیخ چیخ کر اپنی مظلومیت کا رونا روئے، تب بھی نہ کسی کی آنکھ نم ہوتی ہے اور نہ کسی کی آواز اُس کے حق میں بلند ہوتی ہے؛ اِس لیے اگر یہ کہا جائے بے جا نہیں ہوگا کہ جہالت میں پھنسے ہوئے لوگ نہ صرف دین کے اعتبار سے اہلِ علم کی برابری حاصل نہیں کرپاتے؛ بلکہ وہ ہر میدان میں اُن سے پیچھے رہتے ہیں، اُن کے استحصال کا نشانہ بنتے ہیں اور اُن کی ذلت وخواری کی داستان طویل سے طویل تر ہوتی جاتی ہے۔ (جاری.....)

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

# تربیت اولاد اہم ذمہ داری

## تعلیم وتدریس اور عادات وخصائل پر ایک نظر

ازقلم: حضرت مولانا مفتی سیّد محمد عفان صاحب منصور پوری (صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ)

والدین کی اہم ترین ذمہ داریوں میں ایک بنیادی فریضہ اپنے بچوں کو اسلامی ماحول فراہم کرنا اور ان کی دینی تربیت کے لیے معقول نظم کرنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "**لأن يؤدب الرجل ولده خير له من أن يتصدق بصاع**". (سنن الترمذی: البر والصلة/في أدب الاولاد ح: ۱۹۵۱)

والدین کا اپنے بچے کو اسلامی آداب سے واقف کرانا اللہ کی راہ میں ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے اس لیے کہ صدقہ تو بعد میں بھی دیا جاسکتا ہے؛ لیکن تربیت کا جو زمانہ ہے اس میں اگر نگرانی نہ کی گئی، بچوں کے ذہن کو بنانے کی کوشش نہ کی گئی تو بعد میں چاہنے کے باوجود بھی صحیح تربیت ممکن نہیں ہو پائے گی۔ علامہ مناویؒ فرماتے ہیں: بچوں کو آدابِ اسلامی سے واقف کرانا اور ان کو صالح ودیندار بنانے میں کامیابی حاصل کرنا صدقۂ جاریہ کی قبیل سے ہے جب کہ ایک صاع کے صدقہ کا ثواب مستقل جاری نہیں رہے گا؛ بل کہ ختم ہوجائے گا۔ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں تربیت اولاد سے غفلت کے نتیجہ میں انسان مستحق سزا ہوگا اور صدقہ نہ کرنے کی وجہ سے اسے عتابِ الٰہی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

## والدین کا بہترین تحفہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "**ما نحل والد ولده من نحل أفضل من ادب حسن**".

(سنن الترمذي، البر والصلة، ح: ۱۹۵۲)

ماں باپ کی طرف سے اپنے بچوں کے لیے سب سے بہترین تحفہ ان کو شاندار آداب واخلاق سے مزین وآراستہ کرنا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: "**التعلم في الصغر كالنقش في الحجر**" بچپن میں سیکھنا پتھر پر کیے گئے نقش ونگار کی طرح ہے۔ حضرت لقمان فرماتے ہیں "**ضرب الوالد للولد كمطر السماء للزرع**" والدین کا اپنے بچوں کی تنبیہ کرنا ایسے ہی مفید ہے جیسے بارش کا پانی کھیتی کے لیے مفید ہوتا ہے۔ علماء

فرماتے ہیں "من ادب ابنه صغيرا قرت عينه به كبيرا" جو شخص بچپن کے زمانے میں اپنے بچوں کو آداب اسلامی سے واقف کرائے گا تو بڑے ہو کر وہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں گے۔(غذاء الألباب في شرح منظومة الآداب: ۲۳٦/۱ بحواله الدر المنضد) حضرت علی ابن ابی طالبؓ ارشاد فرمایا کرتے تھے: **علموهم وادبوهم** اپنے بچوں کو دین کی تعلیم دیا کرو، ان کو اسلامی آداب سکھایا کرو۔ (تحفۃ المولود ص:۲۲۹ بحوالہ الدر المنضد)

## حب دنیا غالب نہ ہو

بڑی بڑی شخصیات نے امت کو یہ تاکید بے سبب و بے وجہ نہیں کی ہے وہ دُور اندیش تھے، سمجھ رہے تھے کہ دنیا لوگوں کے ذہن و دماغ پر اس طرح غالب آجائے گی کہ لوگوں کو دنیا کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے گا، ہر آدمی دنیا ہی کو پیش نظر رکھے گا اور جب دنیا کو ہر صورت میں مقدم رکھنے کی سوچ پیدا ہوگی تو دین مغلوب ہو جائے گا اور دنیا اس کے مقابلے میں غالب آجائے گی، قرآن پاک میں فرمایا گیا: ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دینے لگے ہو؛ حالانکہ آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے بہت بہتر ہے اور بہت دیر تک باقی رہنے والی ہے۔ یقیناً دنیا بنانے کی بھی فکر ہو؛ تاکہ یہاں عافیت کے ساتھ رہا جا سکے؛ لیکن دنیا ہی دنیا ہو آخرت کی کوئی فکر نہ ہو، یہ مسلمان کو زیب دینے والی چیز نہیں؛ ورنہ مسلمان میں اور غیر مسلم میں کیا فرق رہ جائے گا؟

## والدین کی ذمہ داری

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **من حق الولد على الوالد ثلاثة اشياء: أن يحسن اسمه إذا ولد، و يعلمه الكتاب إذا عقل، و يزوجه إذا أدرك.** (آخرجه الفقيه أبو الليث باسناده عن ابي هريرة، الدر المنضد ٤٠٤/١)

والد پر اولاد کے تین حق ہیں: (۱) جب بچے کی پیدائش ہو تو اس کا اچھا نام رکھا جائے، بامعنی نام ہو، اللہ کی بندگی کا اس نام میں اظہار ہو رہا ہو، انبیاءِ کرام یا حضرات صحابہؓ کے نام میں سے کوئی نام ہو، حضرات صحابیات کے ناموں میں سے کوئی نام ہو، اس نسبت سے نام رکھا جائے کہ یہ عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے، صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تھا، آج کل جو فیشن چل پڑا ہے نئے سے نئے نام رکھنے کا کہ ایسا نام ڈھونڈھ کر لاؤ جو دنیا میں کسی کا نہ ہو، ہر آدمی یہی سوچتا ہے، اب کہاں سے نئے نئے نام لائیں جائیں، پرانا نام رکھنے کو تو لوگ تیار ہی نہیں ہوتے کہ یہ تو بہت سے لوگوں کے نام ہیں؛ حالانکہ ہمیں تو نام کے معنی سے اور نسبت سے مطلب ہونا چاہیے، نئے

نام کے چکر میں ایسے الٹے سیدھے نام رکھ لیے جاتے ہیں کہ کئی کئی سالوں کے بعد وہ نام بدلنے پڑتے ہیں، جب بعد میں کسی سے پوچھا جاتا ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ کسی کا مطلب کیڑا ہے، کسی کا مطلب مکوڑا ہے، نیٹ پر، کچھ نام لکھے ہوئے دیکھ لیے، ان میں کوئی پسند آ گیا تو وہی رکھ دیا، پھر بعد میں سمجھ آئی تو بدلتے پھر رہے ہیں۔

(۲) جب بچہ عقل وشعور کا حامل ہو جائے تو اس کو قرآن پاک پڑھائیں، جب وہ اپنے اچھے اور بُرے کو سمجھنے لگے، چار ساڑھے چار سال کی عمر ہو جائے تو اسے قرآن پاک پڑھانا شروع کر دیا جائے اور دین کے بنیادی عقائد ومسائل سے واقف کرایا جائے۔

(۳) جب بچہ بلوغ کے زمانے میں قدم رکھے، شادی کے لائق ہو جائے تو اس کی شادی کی فکر کی جائے، وقت پر اگر شادی ہو جائے گی تو بہت سے مفاسد وبگاڑ سے معاشرہ بچ جائے گا۔ بے وجہ شادیوں میں تاخیر کی وجہ سے بھی معاشرہ میں گناہ ظاہر ہوتے ہیں، آج کل نوجوانوں میں عام ہونے والی بے راہ روی اور بگاڑ کی ایک وجہ بلا عذر شادیوں میں تاخیر بھی ہے اور اس تاخیر کا سبب وہ غیر شرعی رسوم ورواج ہیں جو ہمارے یہاں شادی بیاہ کے ساتھ لازم ہو گئے ہیں۔

## بچوں کی دینی تربیت نہ کرنے کا انجام

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ایک صاحب اپنے نوجوان بیٹے کو لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور امیر المومنین سے بڑی لمبی چوڑی شکایت کرتے ہوئے کہا: اس نے میرے ناک میں دم کر رکھا ہے، میری نافرمانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، میری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں ہوتا، اب میں مجبور ہو کر آپ کی خدمت میں لے کر آیا ہوں، آپ اس کو سزا دیجیے، یا اسے سمجھائیے، حضرت عمرؓ نے بیٹے کو مخاطب کیا اور ارشاد فرمایا: **أما تخاف الله في عقوق والدک؟** اے نوجوان! والدین کی نافرمانی کرتے ہوئے تجھے اللہ کا خوف اور ڈر نہیں ستاتا؟ کتنی تاکید اللہ نے والدین کی اطاعت کی فرمائی ہے، اس کے باوجود تو باپ کی نافرمانی کرتا ہے، تو اس بیٹے نے جواب دیا: یا امیر المومنین! میں آپ کے سوال کا جواب بعد میں دوں گا، پہلے آپ میرے ایک سوال کا جواب دے دیجیے۔ یہ بتائیے کہ باپ پر بھی میرا کچھ حق ہے یا مجھ پر ہی سارے حقوق ہیں باپ کے؟ سب کچھ مجھے ہی کرنا ہے یا باپ کو بھی کچھ کرنا ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں! باپ پر بھی تمہارا حق ہے، (۱) سب سے پہلا حق تو یہ ہے کہ وہ سلیقہ مند عورت سے شادی کرے؛ تاکہ اس عورت کی گود میں جو بچہ پرورش پائے اس کے اندر دینی جذبات پیدا ہوں، اپنی رفیقۂ حیات اور شریکِ زندگی کے لیے سمجھ دار، دین دار لڑکی کا انتخاب کرے۔

(۲) دوسرا حق یہ ہے کہ پیدائش کے بعد بچے کا اچھا نام رکھے اور (۳) تیسرا حق یہ ہے کہ جب بچہ عقل وشعور کی زندگی میں قدم رکھے تو اس کو قرآن کریم پڑھنا سکھائے اور دین کے بنیادی عقائد ومسائل سے واقف کرائے۔

## باپ نے حق ادا نہیں کیا

جب یہ تین حقوق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیے تو نوجوان نے جواب دیا کہ حضرت میرے والد سامنے موجود ہیں، آپ ان سے معلوم کیجیے کہ انہوں نے ان تین حقوق میں سے میرا کوئی ایک حق بھی ادا کیا ہے یا نہیں (۱) انہوں نے میری ماں کے لیے کسی دین دار سلیقہ مند خاتون کا انتخاب نہیں کیا؛ بلکہ شادی کے لیے ایک ایسی باندی کا انتخاب کیا جو دین داری میں بالکل صفر تھیں۔ ان کی تربیت میں رہ کر میرا دینی مزاج کیسے بنتا؟ (۲) انہوں نے میرا نام رکھا جُعُل اور جعل کہتے ہیں گندگی کے کیڑے کو جب کہ باپ کا حق یہ ہے کہ وہ اچھا نام رکھے اور انہوں نے نام رکھا جعل، تو جب نام یہ ہوگا تو میں اچھا کیسے بن جاؤں گا؟

(۳) مجھے قرآن پڑھانا ان کی ذمہ داری تھی؛ لیکن اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں ایک آیت قرآن کی جو انہوں نے مجھے سکھلائی ہو، اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ اگر میری طرف سے نافرمانی ہو رہی ہے تو قصور ان کا ہے یا میرا؟ حضرت عمرؓ نے بھری عدالت میں باپ کو ڈانٹا، اور فرمایا: **تقول ابني يعقني، فقد عققته قبل أن يعقك، قم عني.** (الدرالمنضد ۱/۴۰۵) تو بیٹے کی نافرمانی کی شکایت کر رہا ہے، اصل نافرمانی ابتداء میں تو نے کی ہے، اسی کے نتیجہ میں اس نافرمانی کو جھیلنا پڑ رہا ہے، تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو نہیں مانا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کے نتیجہ میں اولاد کی نافرمانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے فیصلہ کر دیا کہ میرے سامنے سے چلے جاؤ، پہلے اپنے معاملات درست کرو، بچہ کی تربیت کا نظم کرو اس کے بعد بھی اگر یہ بات نہ مانے، نافرمانی کرے تب میری عدالت میں اپنا مقدمہ لے کر آنا۔

## حق دو حق لو

تو یہ ہے اصل معاملہ، تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے، جب حقوق ادا کیے جاتے ہیں تو دوسروں سے اپنا حق لیا بھی جاتا ہے، اور جب ہم ہی حق ادا نہیں کریں گے تو ہم دوسروں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ ہمارے حق کو بھی ادا کرنے والے ہوں گے، یقیناً اولاد کی ذمہ داری ہر حال میں والدین کی فرماں برداری کرنے کی ہے؛ لیکن یہ ذہن اولاد کا کیسے بنے گا کہ یہ ہمارا دینی فریضہ ہے کہ والدین کی اطاعت کی جائے، یہ ذہن تو ماحول سے بنے گا کہ جس ماحول میں ان کو

یہ باتیں بتائی جاتی ہوں گی، قرآن کی آیات سے ان کو سمجھایا جاتا ہوگا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ان کو بتایا جاتا ہوگا، یا وہ ماحول دیکھتے ہوں کہ کہ بڑوں کا چھوٹوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے اور چھوٹوں کا بڑوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے، اس ماحول کو دیکھ کر بچے خود بہ خود اس رنگ کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے۔

بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ وہ اپنے بچوں کو صراحتاً کوئی حکم نہیں دیتے تھے، کسی چیز کی ضرورت ہوتی اور ان کو یہ احساس ہوتا کہ معلوم نہیں بچے بات مانیں گے یا نہیں تو وہ کسی دوسرے سے کہتے تھے بلا واسطہ بچوں سے نہیں کہتے تھے، کسی صاحب نے سوال کیا کہ حضرت ایسا کیوں؟ اولاد کے سامنے ہونے کے باوجود آپ دوسرے کو حکم دے رہے ہیں اولاد سے کچھ نہیں کہہ رہے ہیں، تو ارشاد فرماتے تھے کہ مجھے اس کا ڈر ہے کہ اگر میں نے اولاد سے کچھ کہا اور انہوں نے بات نہیں مانی تو وہ جہنم کی آگ کے مستحق بن جائیں گے اور میں اپنے بچوں کو اپنی وجہ سے جہنم کی آگ کا مستحق نہیں بنانا چاہتا۔ (الدر المنضود: ۵۰۵/۱)

کتنی بڑی بات ہے، یہ بھی ایک باپ ہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اولاد کے تئیں شفقت ومحبت کے آخری درجہ کے جذبات پائے جاتے ہوں، وہ اس حال میں بھی اولاد کو جہنم کی آگ کا مستحق نہیں بنانا چاہتا تو اس میں دونوں طرف کے پیغام دیے گئے ہیں، ایک تو یہ کہ اولاد کی ذمہ داری والدین کی اطاعت کی ہے اور والدین کی ذمہ داری ہر حال میں شفقت ومحبت کا معاملہ کرنے کی ہے۔

## نیک بختی کی علامت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت میں ارشاد فرمایا: **أربع من سعادة المرء ان تكون زوجته صالحة، وأولاده أبرارا وخلطاءه صالحين وأن يكون رزقه في بلده.**" (الدر المنضود: ۴۰۶۱)

چار چیزیں انسان کی سعادت ونیک بختی کی نشانی ہیں، یعنی چار چیزیں جس کو حاصل ہوگئیں وہ سعید ونیک بخت ہوگیا: (۱) نیک بیوی جس کو مل گئی وہ خوش نصیب ونیک بخت ہے؛ کیوں کہ نیک بیوی شوہر کو بھی نیک بنا کر چھوڑے گی، بیوی کی نیکی کے اثرات لازمی طور پر شوہر کی زندگی میں موجود ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا کی سب سے بہترین دولت نیک زوجہ کا حاصل ہونا ہے، اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشتوں کے انتخاب میں دین داری کو ترجیح دی ہے، تمام چیزوں کو دوسرے نمبر پر رکھا ہے اور دین داری کو اول نمبر پر رکھا ہے، کیوں کہ معیار کامیابی یہی ہے۔ آج سوچ بالکل الٹی بن گئی ہے، دینداری کو تو دیکھا ہی نہیں جاتا، بس دولت وشہرت کو، حسب ونسب کو، جمال کو انہی چیزوں پر آدمی گھومتا رہتا ہے، دین داری پر اس کی نگاہ ہی نہیں جاتی۔

(۲) دوسری چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی: انسان کی سعادت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اللہ اس کو نیک اولاد مرحمت فرمادے، یہ بھی اتنی بڑی دولت ہے کہ زندگی بھر انسان شکر ادا کرتا رہے تو شکر ادا نہیں ہو پائے گا۔ ذرا سوچئے کتنی خوشی بوڑھے ماں باپ کو اس وقت ہوتی ہوگی جب جوان بچہ ان کے کہنے پر چلتا ہوگا، ان کے اشارے پر کام کرتا ہوگا، ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہوگا، ان کے سامنے انکساری سے پیش آتا ہوگا، ان کی نیک نامی کا باعث بنتا ہوگا، کتنی ڈھارس ان کی بنتی ہوگی، کتنا اعتماد ان کو ہوتا ہوگا، کتنی دعائیں ان کے دل سے نکلتی ہوں گی، سوچا نہیں جا سکتا۔

(۳) تیسری چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی! انسان کی سعادت کی علامت یہ ہے کہ اس کے دوست واحباب کا جو سرکل ہے، جن کے ساتھ وہ اٹھتا بیٹھتا ہے، وہ سب نیک اور دینی مزاج رکھنے والے ہوں، نمازی لوگوں کے ساتھ ہمارا اٹھنا بیٹھنا ہو، قرآن سے شغف رکھنے والوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہو، تو ہمارا مزاج وہی بنے گا اور اگر دین سے دُور ہو کر زندگی گزارنے والے، گناہوں میں غرق ہو کر زندگی گزارنے والے لوگوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہوگا، تو اس کے کیا اثرات ہماری زندگیوں پر مرتب ہوں گے اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں، ہر انسان جانتا ہے کہ صحبت کا کتنا اثر انسان کے اوپر پڑتا ہے، جیسی صحبت ہوگی ویسا ہی رنگ اس کی زندگی کا ہوتا چلا جائے گا، اگر دوست اچھے نہیں ہیں تو تنہا رہنا بہتر ہے، اگر دوست نیک وصالح ہیں تو ان کے ساتھ میل جول رکھا جائے؛ ورنہ یکسوئی کے ساتھ الگ ہو کر زندگی گزاریں، کم از کم وہ ان برائیوں سے بچ سکے جو دوسروں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

(۴) چوتھی چیز جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی انسان کی نیکی اور سعادت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کی روزی کا بندوبست اللہ تعالیٰ اسی کے علاقہ کے اندر فرمادیں، عزیز واقارب اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر دُور دراز اس کو روزی کے جتن کے لیے نہ جانا پڑے، یہ بھی انسان کے لیے سعادت کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان سعادتوں سے بہرہ ور ہونے کی توفیق مرحمت فرمائیں، آمین۔

اصلاحِ معاشرہ

قسط دوم

# علماء اور دینی خدام کا باہمی حسد

ازقلم: مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب شیخ الحدیث و مہتمم مدرسہ عربیہ امدادیہ مرادآباد

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ - اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین- یہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے ہم سبق تھے اور دونوں کو آپس میں ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی اور اس درجے کی محبت تھی کہ حضرت والد صاحب کی ہر کتاب کے دو نسخے رکھا کرتے تھے، اور چونکہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی تھا؛ اس لیے حضرت والد صاحبؒ اپنی کتاب کا جو نام رکھتے تھے، وہ اپنی کتاب کا وہی نام رکھتے تھے؛ چنانچہ والد صاحب نے قرآنِ کریم کی تفسیر لکھی اور اس کا نام ''معارف القرآن'' رکھ دیا، انہوں نے بھی قرآنِ کریم کی تفسیر لکھی اور اس کا نام بھی ''معارف القرآن'' رکھ دیا، حضرت والد صاحبؒ نے ایک کتاب ''دعاوی مرزا'' کے نام سے لکھی، انہوں نے بھی ایک کتاب ''دعاوی مرزا'' کے نام سے لکھی، کئی کتابیں ایک ہی نام کی لکھیں۔

لاہور میں قیام تھا، ایک مرتبہ میں لاہور گیا اور ان سے ملاقات کے لیے پہنچا، تو مجھ سے فرمایا کہ ''مولوی شفیع سے میرا سلام کہیو''، لفظ ''مولوی'' سے آگے مولانا کا لفظ کبھی نہیں بولتے تھے، پھر فرمانے لگے کہ مولوی شفیع سے ہمارا باون سال کا تعلق ہے اور الحمدللہ اس باون سالہ تعلق کے دَوران کبھی دل میں ایک دوسرے کے خلاف بال بھی نہیں آیا، پھر فرمانے لگے کہ یہ بتاؤں کہ ایک دوسرے کے خلاف بال بھی کیوں نہیں آیا؟ فرمایا کہ بال اِس لیے نہیں آیا کہ مولویوں کے درمیان جو تعلقات خراب ہوتے ہیں، اس کی وجہ ''حسد'' ہوتی ہے کہ فلاں ہم سے آگے کیوں نکل گیا، اس حسد کی وجہ سے کدورتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں تعلقات خراب ہوتے ہیں، الحمدللہ! میرا مولوی شفیع سے اس قسم کا حسد کبھی ہوا ہی نہیں۔

پھر فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤں کہ ہمارے درمیان ''حسد'' کیوں نہیں ہوا؟ میں نے کہا بتادیں، فرمایا کہ تم نے ''کافیہ'' پڑھا؟ میں نے کہا: جی ہاں! پڑھا، فرمایا کہ اس میں توابع کا بیان آتا ہے، وہ تم نے پڑھا؟ میں نے کہا: جی ہاں! پڑھا، فرمایا کہ اس توابع میں ایک نعت ہوتی ہے، وہ پڑھی؟ میں نے کہا کہ: جی ہاں!

پڑھی، فرمایا کہ نعت کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک متبوع کی نعت اور ایک متعلقِ متبوع کی نعت، مثلاً اگر "زید ن العالم" کہو تو "عالم" زید کی نعت اور اس کی صفت ہے، اور کبھی متعلقِ متبوع کی نعت ہوتی ہے، جیسے "زید ن العالم غلامه" اس میں "عالم" اگر چہ اصلاً غلام کی نعت ہے؛ لیکن جب ترکیب کروگے تو یوں کہوگے "زید" موصوف "العالم غلامہ" صفت؛ حالانکہ "العالم" زید کی صفت نہیں ہے؛ بلکہ اس کے متعلق یعنی غلام کی صفت ہے؛ مگر پھر بھی ترکیب میں اس کو "زید" ہی کی صفت کہا جاتا ہے۔

یہ ساری تفصیل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ: مولوی صاحب! جب مولوی شفیع کا کوئی علمی کارنامہ میرے سامنے آوے تو میں یوں سمجھوں کہ میں "زید ن العالم أخوه" کی قبیل سے ہوں اور جو تصنیف انہوں نے کی ہے، وہ حقیقت میں تو ان کی ہے؛ لیکن ان کے واسطے سے میری بھی ہے، اس وجہ سے ہمارے درمیان طویل عرصے کی دوستی کے باوجود کبھی دل میں حسد پیدا نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ یہ جذبہ ہم سب کو عطا فرمادے، آمین۔

لہٰذا علم کے اندر اخلاص ہونا چاہیے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے علم حاصل کرنا چاہیے، یہ علم اس لیے نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ دوسروں پر فضیلت جتائی جائے، ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیا خوبصورت بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ کیا یہ علم اللہ تعالیٰ نے دوسروں پر جتلانے کے لیے دیا ہے؟ ارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک نعمت دی ہے، اس نعمت کو صحیح مصرف پر استعمال کرو، اس علم کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اس علم کے ذریعہ دوسروں کو نفع پہنچاؤ اور اس کے ذریعہ دوسروں کی خدمت کرو، تم خادم اور دوسری مخلوق مخدوم ہے، علم کے ساتھ یہی خدمت کا جذبہ انسان کے اندر پیدا ہونا چاہیے، نہ یہ کہ اس کے ذریعہ دوسروں پر اپنی فضیلت جتائی جائے۔

اور جب یہ اخلاص پیدا ہو جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کوئی دوسرا شخص علم کے اندر تم سے آگے بڑھتا نظر آئے گا اور اس کے ذریعہ لوگوں کو فائدہ پہونچتا نظر آئے گا تو تم یہی سمجھوگے کہ میرا ہی مقصد حاصل ہو رہا ہے؛ لہٰذا اس پر خوش ہونا چاہیے، نہ یہ کہ اس پر رنجیدہ ہوں۔

یہ "شہرت اور حبِ جاہ اور مقبولیت" دین کے اعتبار سے تو یہ خراب چیز ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی راحت کے اعتبار سے بھی بڑی خراب چیز ہے، اس کے نتیجے میں آدمی کسی کام کا نہیں رہتا، آدمی ایسی فضول چیز کو حاصل کرنے کی طرف کیوں توجہ کرے اور اس کی وجہ سے دوسروں سے کیوں حسد کرے، ارے بھائی! اگر لوگ تمہارے مقابلے میں دوسروں کی طرف زیادہ متوجہ ہو رہے ہیں تو

تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہارا کام آدھے سے زیادہ دوسرا انجام دے رہا ہے؛ اس لیے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، نہ یہ کہ اس سے حسد کرنے بیٹھ جاؤ۔

بہرحال! اگر دل میں یہ اخلاص رہے تو پھر حسد کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور اس حسد سے بچنے کا بڑا ذریعہ یہ ہے کہ ہر عمل میں اخلاص پیدا کرو، جوں جوں اخلاص پیدا ہوگا، ان شاء اللہ یہ حسد زائل ہو جائے گا''۔ (اصلاحی مجالس:۴/۱۵۹-۱۶۴)

امام غزالیؒ نے تعلیم وتدریس سے وابستہ علماء کی ذمہ داریوں کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

''کسی خاص فن کا درس دینے والے مدرس کو چاہیے کہ دیگر علوم وفنون جو اس کے زیر درس نہیں ہیں، طالب علم کے سامنے ان کی اہمیت نہ گھٹائے، مثلاً ادب کا استاذ جسے ادب سے مناسبت ہے، علمِ فقہ کی شان نہ گھٹائے، یا علمِ فقہ کا ماہر علمِ حدیث وتفسیر کی وقعت کم نہ کرے، وہ کسی بھی علم کا ماہر ہو طالب علم پر ہر علم کی گنجائش کھلی رکھے، اور اگر وہ متعدد علوم میں ماہر ہو تو بتدریج ایک علم کے بعد دوسرے علم کی طرف طالب علم کو متوجہ کرے''۔ (احیاء العلوم:۱/۷۶ بیان وظائف المرشد المعلم)

واقعہ یہ ہے کہ ایک فن کے عالم کے ذریعہ دوسرے فنون کی تحقیر دراصل حسد اور کبر کا شاخسانہ ہوتی ہے، ممتاز عالمِ دین حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ نے اپنے فرزند کو مخاطب بنا کر ایک مکتوب میں امام غزالیؒ کے مذکورہ اقتباس کی روشنی میں بے حد اہم ہدایات دی ہیں، طوالت کے باوجود ان کی اہمیت کی وجہ سے انہیں درج کیا جاتا ہے، لکھتے ہیں:

''امام غزالی علیہ الرحمہ اپنے دَور کے حالات کے مطابق یہ فریضہ بتا رہے ہیں، اس دَور میں اور اس کے بعد کے اَدوار میں تعلیم کا جو طریقہ تھا وہ یہ کہ الگ الگ فن کے الگ الگ اساتذہ ہوتے تھے، جو اپنے فن کے طلبہ کو لے کر بساطِ درس بچھائے ہوتے، حدیث کا طالب علم کسی محدث کی خدمت میں حاضر ہوتا، فقہ کا طالب کسی فقیہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتا، علم کلام کا جو یا متکلم کے پاس جاتا، منطق وفلسفہ کا چاہنے والا منطقی وفلسفی کا شاگرد بنتا، لغت وادب کا شیدائی لغوی اور ادیب کی جوتیاں سیدھی کرتا، انسان کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ جس کو جس علم وفن سے دلچسپی ہوتی ہے، دوسرے علم وفن کو وہ قدر ومنزلت نہیں دیتا، جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، وہ خود بھی اور اس کے طلبہ بھی دوسرے فن کے حق میں انصاف کرنے میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں، امام غزالیؒ اس پر متنبہ کرتے ہیں کہ یہ بات طالبِ علم کی خیر خواہی اور خلوص کے خلاف ہے، مدرس کو- خواہ وہ کسی فن کا ہو- چاہیے کہ وہ دوسرے

فن کی تحقیر نہ کرے؛ تا کہ ایک طالب علم جب کسی فن میں معتد بہ مہارت پیدا کر لے تو دوسرے ضروری اور مفید فن کی تحصیل میں اسے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

دار العلوم دیو بند کے آغاز سے جس طرح کے مدرسوں کا رواج ہوا ہے، ان میں اکابر نے ایسا انتظام کر دیا ہے، کہ تحقیر و تحسین کی یہ کشمکش بہت حد تک کم ہوگئی؛ کیونکہ علم دین کے لیے ہر ضروری اور معاون فن کو ان حضرات نے درس میں شانہ بشانہ رکھ دیا ہے، نحو، صرف، منطق، فقہ، حدیث، تفسیر، بلاغت اور ادب سب تکمیل تک ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہتے ہیں، پڑھانے والے بھی بیک وقت متعدد فنون پڑھاتے ہیں، اس طرح ترجیحات کی گنجائش نہیں نکلتی۔

لیکن اسی طرح کی اس سے زیادہ خطرناک ایک بیماری پیدا ہوتی ہے، جس کے نتائج طالب علم کے حق میں بہت مضر نکلتے ہیں، وہ یہ کہ علوم کی ترجیحات کے بجائے اساتذہ کے درمیان تنافس؛ بلکہ تحاسد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، یہ کیفیت دینی اور اخلاقی اعتبار سے بھی زہر ہے اور طالب علم اور مدرسہ کے لیے بھی مضر ہے۔

پہلے ہر مدرس کی درسگاہ الگ ہوتی تھی، اب ایک ہی مدرسے میں کئی مدرس ہوتے ہیں، یہ مختلف استعداد، مختلف طبیعت و مزاج کے ہوتے ہیں، اور مختلف اساتذہ کے تلامذہ ہوتے ہیں، ایک ہی مدرسہ میں پڑھاتے ہیں، طلبہ کی ہر جماعت متعدد اساتذہ سے پڑھتی ہے، پسند و ناپسند کا معیار بھی الگ الگ ہوتا ہے، اس ماحول میں فطرتِ انسانی کی وہ کمزوری جسے حسد کہا جاتا ہے، بہت زور کرتی ہے، اگر استاذ قلب و دماغ کا کمزور ہوا تو دوسرے پر تنقید و تبصرہ یا شرعی زبان میں غیبت و تنقیص میں مبتلا ہو جاتا ہے، ایک مدرس دوسرے مدرس کو طلبہ کی نگاہ میں اور ماحول کے اندر کم رتبہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس سے طلبہ میں باہم کشمکش پیدا ہو جاتی ہے، پھر تحصیل علم کی سرگرمی ٹھنڈی پڑنے لگتی ہے۔

اس لیے میں تمہیں اس مسئلہ میں بہت تاکید کرتا ہوں کہ ہرگز ہرگز کسی سے حسد نہ ہو، حاسد جب حسد کرتا ہے تو حق تعالیٰ پر اعتراض کرتا ہے، وہ اللہ سے خوش نہیں ہے کہ فلاں کو علمی تبحر و وسعت، مقبولیت و محبوبیت اور خوش تقریری کی دولت کیوں ملی؟ اس سے سمٹ کر میری طرف کیوں نہیں چلی آتی، بھلا بتاؤ، اللہ پر اعتراض کرنے والا کیسے کامیاب ہو سکتا ہے؟ تمہارا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ جس کسی کی جو خوبی ہو، اُسے خوش دلی سے مان لو، اس کا اعتراف کرو اور اس اعتراف کا جو تقاضا ہو، احترام کا، استفادے کا، مدح و توصیف کا، اس میں بخل نہ کرو، جو نعمت اللہ نے اسے دی ہے تم اس پر راضی ہو تو اللہ سے راضی ہو،

ہرگز ہرگز اس کی تنقیص نہ کرو، نہ صراحۃً نہ کنایۃً، نہ طلبہ کے سامنے نہ اپنے ہم چشموں اور معاصرین کے درمیان، غیبت جیسی کچھ معصیت ہے تم جانتے ہو، پھر آدمی جب غیبت کرتا ہے تو غیبت ہی تک محدود نہیں رہتا، وہ اس حد سے گزر کر تہمت اور بہتان کی مہلک اور اندھیری وادی میں جا گرتا ہے، پھر وہ اللہ کے یہاں بھی ذلیل وخوار ہوتا ہے اور مخلوق بھی اس سے بیزار ہو جاتی ہے۔

فی زمانہ مدارس میں بعض اوقات مدرسوں کی مجلسیں غیبت، بہتان، استہزاء وتحقیر کی غلاظتوں کا انبار بن جاتی ہیں، ان سخت معاصی میں مبتلا ہو کر بھی عالم کے عالم اور بزرگ کے بزرگ بنے رہتے ہیں، معصیت سے بچنا بہت ضروری ہے اور یہ حقوق العباد قسم کی معصیتیں انسان کے قلب ودماغ کے لیے سخت مضر ہیں اور مرنے کے بعد تو خطرۂ عظیم ہیں؛ اس لیے مدرسے میں قدم رکھو تو اپنے ہی جیسے یا اپنے سے بڑے علماء کا گوشت نہ کھاؤ، اس سے اس طرح بچو جیسے آدمی سانپ سے بچتا ہے، یہ موضوع بہت ضروری ہے''۔ (منصب تدریس اور حضرات مدرسین: ۳۵-۳۷)

امام محمد بن حسین آجری علیہ الرحمہ نے اپنے رسالہ'' اخلاق العلماء'' میں علمائے سوء کے اوصاف میں ''حسد'' کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایسے عالم کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ:

''اگر اس کے دَور میں علماء کی تعداد زیادہ ہو اور زمرۂ علماء میں ان کا شمار ہوتا ہو تو چاہتا ہے کہ اس کا بھی تذکرہ ان میں ہو، اگر کسی مسئلہ میں اس سے سوال نہ کیا جائے اور دوسرے علماء سے پوچھا جائے تو اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ مجھ سے دریافت کیا جائے؛ حالانکہ اس پر اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ چلو میں ذمہ داری سے چھوٹا اور اگر کسی دوسرے نے مسئلہ بتایا اور اس کا بتایا ہوا مسئلہ غلط ثابت ہو گیا تو اسے بہت خوشی ہوتی ہے؛ حالانکہ اسے رنج ہونا چاہیے تھا، اگر کسی عالم کی وفات ہوتی ہے تو یہ خوش ہوتا ہے کہ اب لوگ اس کے محتاج و نیازمند ہوں گے، اگر اس سے کوئی ایسی بات پوچھی جائے جو اسے معلوم نہ ہو تو اسے اپنی لاعلمی کا اقرار کرنے میں عار محسوس ہوتا ہے اور تکلف کر کے ایسا جواب دیتا ہے جس کی گنجائش نہیں ہوتی، اگر اسے معلوم ہو کہ فلاں آدمی مسلمانوں کے لیے اس سے زیادہ مفید ہے تو اس کی زندگی اسے ناپسند ہو جاتی ہے اور لوگوں کی رہنمائی اس کی جانب نہیں کرتا، اگر اس نے کوئی بات بتائی، اس کی یہ بات مان کر لوگوں نے اتباع کر لیا اور جاہلوں کے نزدیک اس کی وجہ سے ایک مقام ومرتبہ اسے حاصل ہو گیا، پھر معلوم ہوا کہ بات غلط تھی، تو اب اسے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں عار محسوس ہوتا ہے، غلطی کا اعتراف تو ایک طرف رہا اس اندیشہ سے کہ اس کا

مرتبہ مخلوق کی نگاہ سے گر نہ جائے، اپنے اس قول کی حمایت میں دلائل فراہم کرنے لگتا ہے۔
اپنے کو زمرۂ علماء میں شمار کرتا ہے؛ حالانکہ اعمال اس کے سب احمقوں والے ہیں، دنیا کی محبت، جھوٹی تعریف کی خواہش اور جاہ ومنزلت کی حرص نے اس کو فتنہ میں ڈال رکھا ہے، علم کے ذریعہ ایسی آرائش کرتا ہے جیسے کوئی خوبصورت عورت کپڑوں سے اپنے کو سنوارتی ہے؛ لیکن اپنے علم کو عمل سے مزین نہیں کرتا''۔ (ایضاً:۶۳)

حسد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عالم اپنے معاصر علماء کے نقائص طلبہ اور عوام کے سامنے اُجاگر کرتا ہے، عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ نے لکھا ہے کہ:

اساتذہ کو چاہیے کہ مدرسہ کے نظم اور اس کے مہتمم وارا کین اور دوسرے اساتذہ کی خرابیاں طلبہ کے سامنے نہ بیان کریں، اگر وہ چیزیں واقعی قابلِ اصلاح ہیں تو ذمہ دار حضرات کو دیانتداری اور خیرخواہی کے ساتھ مشورہ دے دیا کریں؛ تاکہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اس کی اصلاح کردیں، طلبہ کے سامنے اس قسم کی چیزیں لانے ہی کا نتیجہ ہے جو اسٹرائک کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، تجربہ تو یہی بتاتا ہے کہ طلبہ کے ذریعہ جو فساد مدارس میں رونما ہوتا ہے اس کی پشت پناہی کرنے والا مدرسہ کا کوئی مدرس ہوتا ہے۔
غیبت، کسی کی پردہ دری، افتراق بین المسلمین تو ہر ایک کے لیے ناجائز اور حرام ہے، تو پھر علماء اور مقتدایانِ دین کے لیے یہ کس طرح جائز ہوں گی، مدارس میں جب اس قسم کی بہت سی خرابیاں آجاتی ہیں اور اساتذہ ایک دوسرے کی بُرائی میں لگ جاتے ہیں تو اس کا اثر طلبہ اور عوام پر بہت بُرا پڑتا ہے، پھر جب وہ درس اور وعظ میں ان معائب (یعنی غیبت وغیرہ) کی برائیاں اور ان پر وعید بیان کرتے ہیں تو ان کی اس لفاظی کا کسی کے دل پر اثر نہیں ہوتا اور فوراً ان کے کارنامے آئینہ بن کر لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں۔
علامہ شعرانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ہم سے عہد لیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص ہمارے سامنے ہمارے ہم عصر کی تعریف کرے تو ہم بھی اس کی تعریف اور مدح میں موافقت کریں اور اس میں میخ نہ نکالیں خواہ وہ ہم پر اعتراض ہی کرتا رہتا ہو، کیوں کہ جب ہم بجائے اس کی برائی اور اعتراض کرنے کے تعریف کریں گے تو جلد ہی وہ اپنی حرکت سے باز آجائے گا اور برائی کرنا چھوڑ دے گا، اس تدبیر سے ہم خود گناہ سے بچ جائیں گے اور اس کو بھی بچالیں گے، یہ عہد آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔
ذرا اس زمانے کے علماء اور سالکین غور سے دیکھیں کہ اس پر کہاں تک عمل کیا جاتا ہے، افسوس صد افسوس یہ مرض مدارس اور خانقاہوں میں عام طور پر سرایت کرتا جارہا ہے، نتیجہ ظاہر ہے کہ جو دنیا میں سب سے

بہترین مقامات تھے، آج وہی سب سے زیادہ شرور وفتن کے چشمے بنے ہوئے ہیں، جن کے بدبودار سوتے بہہ بہہ کر دنیا کو متعفن کر رہے ہیں، اللہ پاک سب کی حفاظت فرمائے"۔ (تحفۂ مدارس:۲۴۱-۲۴۲)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا ملفوظ ہے:

"ایک مرض اپنی جماعت میں اور پیدا ہو گیا ہے کہ آپس میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ فلانے بڑے بڑھے ہوئے ہیں اور فلانے کم ہیں، ایک دوسرے کو فضیلت دے کر دوسرے کے عیوب بیان کرتے ہیں، اپنے حضرت کو دیکھا کہ مجمع میں بکثرت لوگ ہوتے؛ مگر یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کون کس سے بیعت ہے؟" (العلم والعلماء: افادات حضرت تھانویؒ:۳۶۳)

امام ابوحازم فرماتے ہیں:

"گزشتہ زمانے میں جب (خیر کا غلبہ تھا) کوئی شخص اپنے سے زیادہ صاحبِ علم سے ملتا تھا تو اُس کو نعمت عظمیٰ اور غنیمتِ کبریٰ سمجھتا تھا اور استفادہ کرتا تھا اور اپنے برابر کے عالم سے ملتا تھا تو علمی مذاکرے میں مشغول ہو جاتا تھا اور اپنے سے کم علم والے سے ملتا تھا تو فخر وتکبر کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا، اور اب زمانہ ایسا آ گیا ہے کہ آدمی اپنے سے بڑے علماء کو ہدفِ ملامت اور نشانۂ نقد بناتا ہے اور لوگوں میں یہ تاثر دیتا ہے کہ ان کو کوئی بڑا کمال حاصل نہیں ہے اور مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اپنے برابر کے علماء سے اعراض کرتا ہے، باہم علمی مذاکرے کو پسند نہیں کرتا اور اپنے سے کم علم والے کو حقیر سمجھتا ہے اور دوسروں کے سامنے اس کی تذلیل کرتا ہے، لوگوں کی بربادی کا راز یہی ہے"۔ (جامع بیان العلم وفضلہ:۱۵۱/۲)

شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"بسا اوقات بعض وہ لوگ جو عالم کہلاتے ہیں (مگر درحقیقت وہ علماء میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں ہیں) وہ ہر اُس شخص سے حسد کرنے لگتے ہیں جسے اللہ نے علم نافع اور عمل صالح سے نوازا ہو اور خدمت دین کی توفیق عطا فرمائی ہو، یہ بہت بُری خصلت ہے اور یہ اُن یہودیوں کی مشابہت ہے جن پر اللہ کا غضب نازل ہو چکا ہے"۔ (محاسد العلماء: شیخ احمد القطان)

اہلِ علم کے باہمی حسد کے مختلف مظاہر اور شکلیں ہوتی ہیں، جن میں سے چند نمایاں اُمور یہ ہیں:

## (۱) تحقیر کی نیت سے دعائیہ کلمات کا استعمال:

جب کسی عالم کو دوسرے عالم سے حسد ہوتا ہے، پھر کوئی شخص اس سے اس عالم کے بارے میں دریافت کرتا ہے تو یہ حاسد عالم محسود عالم کو دعا دیتے ہوئے کہتا ہے: غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ (اللہ ان کو معاف فرمائے) اَصْلَحَهُ اللّٰهُ

(اللہ ان کی اصلاح فرمائے) هَـدَاهُ اللّٰـهُ (اللہ ان کو ہدایت سے نوازے) یہ الفاظ بظاہر دعا کے ہیں؛ مگر حاسد عالم کے انداز واطوار سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان دعائیہ کلمات سے اس کا مقصد دعا دینا نہیں ہے؛ بلکہ مخاطب کے سامنے یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ عالم گناہوں میں مبتلا ہے، اللہ اسے معاف فرمائے، وہ گمراہی پر قائم ہے، اللہ اسے ہدایت سے نوازے، وہ بگاڑ کا شکار ہے، اللہ اس کی اصلاح فرمائے۔

## (۲) عالم کے علم اور کام کی تنقیص:

حسد کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ دوسرے کسی عالم کا علمی رسوخ دیکھ کر اس کے علم، تصنیف، درس اور خطاب وغیرہ کے بارے میں تنقیص پر مبنی کلمات استعمال کیے جاتے ہیں۔

## (۳) بدعقیدگی یا کج فکری وغیرہ کا الزام:

حسد کا شاخسانہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک عالم دوسرے عالم کی مقبولیت اور مرکزیت سے پریشان ہوکر اسے بدنام اور رسوا کرنے کے لیے اس کے اوپر بدعقیدگی، کج فکری یا گمراہ افراد وطبقات سے تعلق اور وابستگی وغیرہ کے الزامات عائد کردیتا ہے، علمائے سلف میں بطور خاص حضرت امام بخاریؒ کے ساتھ بار بار اور مختلف شہروں میں ایسا ہی ہوا کہ معاصر علماء نے (جن میں اکثر علمائے سوء تھے جو بدنیت بھی تھے اور ظالم حکمرانوں کے مقرب بھی تھے، جب کہ کچھ مخلص علماء بھی تھے جو غلط فہمیوں کے حصار میں آگئے تھے) ان کے اوپر بدعقیدگی اور کج فکری کے جھوٹے الزامات لگائے اور طوفان کھڑا کردیا۔

## (۴) عالم کی غلطیوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کا تجسس:

حسد کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ حاسد عالم دوسرے عالم کی ٹوہ میں لگ جاتا ہے اور اس کی غلطیوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کی چھان بین کرتا رہتا ہے؛ چونکہ انبیاء کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہے، بڑے سے بڑے صاحبِ علم کے کام اور شخصیت میں نقد واحتساب کی گنجائش ہوتی ہے اور خامیاں پائی جاتی ہیں، عالمِ ربانی دوسرے علماء کی ایسی خامیوں کی پردہ پوشی بھی کرتا ہے اور اچھی توجیہ بھی کرتا ہے؛ مگر بسا اوقات حسد کا جذبہ کسی عالم پر اس درجہ غالب آجاتا ہے کہ وہ دیگر علماء کی غلطیوں ہی کو پیش نگاہ رکھتا ہے پھر رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کرتا ہے، اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ محسود لوگوں کی نگاہوں سے گر جائے۔

## (۵) عالم سے علم حاصل نہ کرنے کی تلقین:

حسد کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص حاسد عالم سے اس کے محسود عالم سے استفادہ کی بابت معلومات

یا مشورہ کرتا ہے تو وہ فوراً یہ کہتا ہے کہ ان کے بجائے فلاں سے استفادہ کیا جائے، یہ مشورہ دیانتداری کی بنیاد پر نہیں؛ بلکہ ان سے حسد کی بنیاد پر ان کی نااہلی کو ثابت کرنے اور حقیر ظاہر کرنے کے مقصد سے دیا جاتا ہے۔

## (۶) کسی عالم کے علمی مرکز اور سرچشمہ کی تحقیر:

حسد کی ایک نمایاں شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ حاسد عالم اپنے محسود عالم کا تذکرہ آنے پر یہ استفسار کرتا ہے کہ: انہوں نے کہاں تعلیم حاصل کی؟ ان کے اساتذہ کون ہیں؟ مثلاً: وہ جامعہ ازہر مصر یا دارالعلوم دیوبند یا مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہیں یا نہیں؟ ان کے پاس پی ایچ ڈی کی سند ہے یا نہیں؟ ان کے نمبرات کتنے رہے؟ کیا وہ پوزیشن ہولڈر رہے؟ کاش! ان کی فراغت ازہر یا دیوبند سے ہوتی، کاش! وہ فرسٹ پوزیشن ہوتے، اگر وہ فلاں اساتذہ سے پڑھتے تو بہتر ہوتا۔

حاسد عالم یہ ساری باتیں صرف اس نیت سے کرتا ہے کہ موجود لوگوں کے سامنے اس عالم کو بے حیثیت ثابت کیا جائے، جس ادارے سے اُس عالم نے استفادہ کیا ہے، اُس مرکز کی تحقیر کی جائے؛ حالانکہ علم اصلاً عطائے خداوندی ہے اور احادیث کی صراحت کے مطابق اللہ جس کے ساتھ عظیم خیر کا ارادہ فرماتا ہے اسے علم وتفقہ سے مالا مال کر دیتا ہے، افراد، ادارے اور شخصیات وسائل ہیں، مقاصد نہیں ہیں، اسی طرح نمبرات اور ڈگریاں علامت ہیں، اصل نہیں ہیں، علمی تاریخ میں بہت سی ایسی مثالیں ہیں کہ چھوٹی درسگاہوں اور غیر معروف اساتذہ سے استفادہ کرنے والوں کا علمی ڈنکا پوری دنیا میں بجا اور ان کا لوہا سب نے مانا؛ اس لیے اصل نگاہ استعداد اور خدمت پر ہونی چاہیے نہ کہ انتسابات اور علامتوں پر۔

## (۷) بے جا مباحثہ اور جھک بازی:

حسد کرنے والا عالم بسا اوقات دیگر علماء کو ذلیل کرنے کے لیے ان سے بے جا مباحثے کرتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ کبھی حاسد عالم کا اختصاص ایک موضوع پر ہوتا ہے اور محسود کا اختصاص دوسرے موضوع پر ہوتا ہے، اب حاسد اپنے اختصاص کے موضوع پر محسود سے برسرِ عام مباحثہ کرتا ہے اور مقصد اسے رسوا کرنا ہوتا ہے، احادیث میں ''دیگر علماء سے بے جا مباحثہ اور جھگڑا کرنے کی نیت سے علم حاصل کرنے'' پر سخت وعید کے الفاظ آئے ہیں۔

## (۸) چغل خوری:

اہلِ علم کے باہمی حسد میں ایک دوسرے کو پھنسانے، موردِ الزام ٹھہرانے اور ذلیل ورسوا کرنے کی نیت سے اِدھر اُدھر باتیں منتقل کرنا اور چغلی کرنا بھی شامل ہے۔

## (۹)احسان جتانا:

چونکہ دنیا اسباب ووسائل سے جڑی ہوئی ہے، اہلِ علم میں بھی بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک عالم دوسرے عالم کی مدد کرتا ہے، یہ مدد ملازمت فراہم کرانے، سفارش، تائید، مالی تعاون، علمی تعاون وغیرہ مختلف صورتوں میں ہوتی ہے، اگر دلوں میں اخلاص ہو تو دوسرے کی مدد کرنے والا کبھی نہ احسان جتاتا ہے اور نہ اس عنوان سے شرمندہ کرتا ہے، اور مدد حاصل کرنے والا ہمیشہ احسان مند اور دعا گو رہتا ہے؛ مگر جب حسد پیدا ہو جاتا ہے تو مدد کرنے والا عالم احسان بھی جتاتا ہے اور برسرِ عام بار بار شرمندہ بھی کرتا ہے اور مدد حاصل کرنے والا احسان فراموشی اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

یہ چند نمونے بطور مثال ذکر کیے گئے ہیں۔

سلف کا اُسوہ یہ بتاتا ہے کہ علماء اور خدامِ دین میں ایک دوسرے کے تئیں وحدت ومودت اور نصح واُلفت کا اَٹوٹ رشتہ ہونا چاہیے، ان کے دلوں میں ہر مرحلے میں تعاونِ باہم کا جذبہ بیدار رہنا چاہیے۔

اولیاءِ امت کے سیر وسوانح میں یہ فکر انگیز واقعہ ملتا ہے کہ پانی پت کے علاقے میں ایک بافیض مردِ خدا شیخ شمس الدین ترکؒ کی خانقاہ آباد تھی اور فیض تسلسل سے جاری تھا، کچھ عرصے بعد وہاں ایک دوسرے بزرگ شیخ بوعلی قلندرؒ کی آمد ہوئی اور انہوں نے بھی اسی علاقے میں اپنا سلسلۂ خدمت شروع کر دیا، اب پہلے بزرگ نے ایک پیالے میں دودھ بھر کر اپنے خادم کے توسط سے اُن دوسرے بزرگ کی خدمت میں بھیجا، دوسرے بزرگ لبریز پیالہ دیکھ کر مسکرائے اور اس میں گلاب کے پھول کی کچھ پنکھڑیاں ڈال کر واپس کر دیا، پہلے بزرگ نے لبریز پیالہ بھیج کر یہ پیغام دینا چاہا تھا کہ اس علاقے میں میں پہلے سے فیض وخدمت کا سلسلہ جاری کیے ہوئے ہوں، یہاں دوسرے سلسلے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، جیسے پیالہ بھرا ہوا ہے، اب اس میں مزید گنجائش نہیں ہے، مزید کچھ ڈالا جائے گا تو وہ گر جائے گا اور ضائع ہو جائے گا، اسی طرح تربیت واصلاح کا میرا سلسلہ اس خطہ کے لیے کافی ہے، مزید کسی اور سلسلے کی یہاں ضرورت نہیں ہے؛ اس لیے آپ کسی اور خطے کا انتخاب کریں جہاں ضرورت ہو تو یہ بہتر اور مفید ہوگا، دوسرے بزرگ نے لبریز پیالے میں پھول رکھا، اس پھول نے دودھ کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا؛ بلکہ پیالے اور مشروب کی زینت اور رونق بڑھادی؛ نیز خوشبو پیدا کر کے تکمیل کر دی، اس میں یہ پیغام مضمر تھا کہ میرا کام اور سلسلہ آپ کے فیض اور سلسلہ کو نقصان نہیں پہونچائے گا؛ بلکہ آپ کے کام کے لیے معاون، باعثِ رونق وزینت اور تکمیل کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

اس واقعہ سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اہل علم و دین کا باہم ربط کیسا ہونا چاہیے، پہلے بزرگ نے ''حسد، بغض، مخالفت، گروپ بندی اور تشدد'' کے اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کیے، لطیف پیرایے میں اپنے دل کا احساس پہونچا دیا، پھر دوسرے بزرگ نے ''جوابی کارروائی اور کبر کے مظاہرے'' کے بجائے خوبصورت انداز میں اپنے خلوص وتعاون

کی یقین دہانی کرادی، یہ اُسوہ تمام علمائے امت اور خدامِ دین کے لیے رہنما نمونہ اور مشعلِ راہ ہے۔

اسی طرح دینی وملی خدمات انجام دینے والی تنظیمات اور جماعتوں میں بھی تقابل کا انداز اور ہر خدمت کا کریڈٹ اپنے نام کرنے کی کوشش سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے، ملی، قومی اور مذہبی خدمات انجام دینے والی تحریکات کو جو روگ گھن کی طرح آج لگے ہوئے ہیں ان میں ایک تو اللہ کے ہاں حسنِ قبول حاصل ہونے کی فکر کے بجائے عوامی مقبولیت کے حصول کا بخار ہے اور دوسرا روگ باہم تقابل اور حسد کا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے تلامذہ کو خطاب کر کے فرمایا تھا:

أَنْتُمُ الْيَوْمَ فِي زَمَانِ الْهَوَىٰ فِيْهِ تَابِعٌ لِلْعِلْمِ، وَسَيَأْتِي عَلَيْكُمْ زَمَانٌ يَكُوْنُ الْعِلْمُ فِيْهِ تَابِعًا لِلْهَوَىٰ. (احیاء العلوم: ۱/۱۰۵)

’’آج تم ایسے دَور میں ہو جس میں خواہشِ نفس علم کے تابع ہے؛ لیکن عنقریب تم پر ایسا دَور آئے گا جس میں علم خواہشِ نفس کے تابع ہو جائے گا‘‘۔

آج یہ منظر ہم سب کے سامنے ہے کہ خواہشاتِ نفس نے ہم سب کو اپنا اسیر بنالیا ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ حالات میں اہلِ علم اور دین کی مختلف جہات سے خدمت کرنے والے طبقات میں (۱) حسد (۲) اپنے کام کی اہمیت کا یقین اور دوسروں کے کاموں کی تنقیص (۳) بدگمانی کے امراض بہت عام ہو گئے ہیں اور اس کی نحوست یہ ظاہر ہو رہی ہے کہ علماء میں اور خدامِ دین میں باہمی اجتماعیت مفقود ہوتی جا رہی ہے اور گروہی تعصّبات کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں اور عوام کے حلقوں میں اہلِ علم کی بے وقاری، بے توقیری اور بے وزنی بڑھتی جا رہی ہے، جب تک خدامِ علم و دین ان روگوں کا علاج نہیں کریں گے خالق اور مخلوق کی نگاہوں میں محبوب و مقبول نہیں ہوسکیں گے، عربی شاعر کا شعر مہمیز لگانے کے لیے کافی ہے:

يَا مَعْشَرَ الْعُلَمَاءِ يَا مِلْحَ الْبَلَدْ
مَا يُصْلِحُ الْمِلْحَ إِذَا الْمِلْحُ فَسَدْ

اے علماء: آپ امت کے لیے وہی مقام رکھتے ہیں جو کھانے میں نمک کا مقام ہوتا ہے اور جب نمک ہی بگڑ جائے اور خراب ہو جائے تو کون اُسے صحیح کر سکتا ہے؟

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ

# دینِ اسلام کی خوبی

ازقلم: مفتی محمد علی صاحب قاسمی، مہتمم جامعہ قاسم العلوم جے نگر فورتھ بلاک، بنگلور

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے نبی ورسول بھیجا اور انہیں دین عطاء فرمایا اور یہ کہلا بھیجا کہ تمام انسانیت کی دنیوی اور اُخروی کامیابی کا مدار دین پر عمل کرنے پر ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین دینِ اسلام ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کے علاوہ سارے دینوں کو منسوخ کردیا اور یہ اعلان کردیا: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کامل ومکمل دین عطا فرمایا اور اس کا اعلان سورۂ مائدہ آیت نمبر۳ میں فرمایا: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ ایک طرف اللہ کا دین کامل ومکمل ہے اور یہ دین ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کرسکتا ہے، دوسری حقیقت یہ ہے کہ زندگی تغیر پذیر ہے اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہے؛ چونکہ یہ دین آخری اور عالمگیر دین ہے اور یہ امت آخری اور عالمگیر امت ہے؛ اس لیے دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ رہے گا اس امت کو جو زمانہ عطا کیا گیا ہے، وہ سب سے زیادہ پراز تغیرات اور پراز انقلابات ہے؛ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے دو انتظامات فرمائے۔

ایک تو یہ کہ اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل ومکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کرسکے اور ہر زمانے کے مسائل اور مشکلات حل کرسکے، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے کہ وہ اس دین کو ہر دَور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ رکھیں گے۔

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کردیں، اس کی سب سے بڑی مثال مسیحیت ہے وہ اپنے عہد کے آغاز یعنی پہلی صدی کے نصف ہی میں ایسے تحریف کا شکار ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی، خالص توحیدی مذہب سے ایک مشرکانہ مذہب میں تبدیل ہوگیا۔

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ شروع ہی سے اسلام کے قلب وجگر پر بھی ایسے حملے ہوئے کے کوئی دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لاسکتا ہے؛ لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی اور اپنی اصلی

شکل میں قائم رہا ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں اسلامی روح کے لیے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف صلیبیوں اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا کہ اسلام کا نام ونشان ختم ہوجائے؛ لیکن اسلام نے ان سب داخلی اور خارجی حملوں کا مقابلہ کرتے ہوئے زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں۔ ہر دَور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے تحریفات وتاویلات کا پردہ چاک کردیا اور حقیقتِ اسلام کو اُجاگر کیا، بدعات وخرافات، عقائدِ باطلہ اور مشرکانہ اعمال کے خلاف اعلانیہ جہاد کیا، اسلام میں نئی قوت وحرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کردی یہ افراد دماغی علمی اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانے کے ممتاز ترین افراد تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقاء منظور ہے اور دنیا کی رہنمائی کا کام جو پہلے انبیاء سے لیتا تھا اب رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور مجددین ومصلحین سے لے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں دین کے صحیح حاملین پیدا فرمائے، ایک دَور میں جو دین کے صحیح حاملین ہوتے ہیں اُن کے بعد دوسرے دَور میں اللہ تعالیٰ ان کے صحیح جانشین پیدا فرماتا رہا اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

**عن إبراهيم بن عبد الرحمن العذريؓ قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يحمل هٰذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغافلين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين.** (مشکوٰۃ شریف ۳۶/۱)

''حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن العذری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر زمانے کے گزرے ہوئے سلف کے صحیح اور ثقہ جانشین قرآن وحدیث کے اس علم کے حامل ہوا کریں گے جو قرآن وسنت میں حد سے تجاوز کرجانے والے گمراہ کن بدعتیوں کی تحریفات کو مٹادیں گے اور باطل اور جھوٹے لوگوں کے جھوٹے دعووں کی تردید کریں گے اور جاہل اور ان پڑھوں کی غلط تاویلات کو مٹادیں گے''۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ امتِ محمدیہؐ میں ہر سو سال پر ایسے علماء فقہاء اور دین کے صحیح حاملین پیدا ہوتے رہیں گے جو دین کے اندر آئی ہوئی خرافات اور بگاڑ اور جہالت کو مٹاتے رہیں گے اور دینِ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور اس کی تجدید اسی نہج پر کریں گے جس نہج پر اللہ کے رسولؐ اور صحابہؓ نے کی ہے، دینِ اسلام سے پہلے ہر دَور وہر قوم میں انبیاء علیہم السلام تشریف لاکر دین کی تجدید کیا کرتے تھے، ایک نبی اور رسول کے گزرنے کے بعد ان کے دین میں جو خرابیاں آجاتی تھیں بعد میں آنے والے نبی اور رسول ان خرابیوں کو دُور کرکے دین کی نشاۃِ ثانیہ اور اس کی تجدید کیا کرتے تھے۔

لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا نبی پیدا نہیں ہوگا؛ اس لیے

اللہ تعالیٰ نے دین کی تجدید کا کام علماء وصلحاء سے لیا، علماء اپنے علم کے ذریعے، فقہا اپنے فقہ کے ذریعے، محدثین اپنی حدیثوں کے ذریعے اور قراء صحیح قرأت کے ذریعے، واعظین اپنی اچھی نصیحتوں کے ذریعے اور زاہدین اپنے زہد وتقویٰ کے ذریعہ سے دین کی تجدید کریں گے، اور اللہ تعالیٰ ہر سو سال پر دین کی تجدید کرنے والے مجدد دین پیدا کرتا رہے گا۔

**عن أبي هريرةؓ فيما اعلم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها.** (مشکوٰۃ شریف:۳۶/۱)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان چیزوں میں سے جن کو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا ہے اور یاد کیا ہے یہ بھی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر سو سال پر ایسے لوگ بھیجتا ہے جو اس امت کے دین کی تجدید کرتے رہیں گے''۔

مرقاۃ الصعود کے اندر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو مجدد بنایا اور ان کی مجددیت امت کے سامنے واضح ہو چکی تھی، اور پہلی صدی کے مجددین میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے؛ کیونکہ ان کا مجددانہ کارنامہ امت کے سامنے واضح ہے اور قیامت تک جاری رہے گا، اگرچہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام ابوحنیفہ کا ذکر نہ کیا، تو پھر بھی بات واضح ہے اور دوسری صدی ہجری کے شروع میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی مجددیت ثابت ہوئی اور ان کا مجددانہ کارنامہ بھی امت کے سامنے آچکا تھا۔

اور بعض لوگوں نے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی مجدد کہا ہے، ان کے اولیاء اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اسی طرح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ بھی مجدد تھے، کہا جاتا ہے پنجاب سے بنگال تک ایک سفر میں نوے لاکھ انسانوں نے ان کے ہاتھ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھا اور اسی طرح خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں پر ہزاروں لاکھوں انسانوں نے اسلام کا کلمہ پڑھا۔

دسویں صدی ہجری میں شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ کو اللہ نے پیدا فرمایا، جن کو من جانب اللہ مجدد الف ثانی ہونے کا لقب ملا ہے، انہوں نے جلال الدین اکبر کی نئی شریعت اور نئے دین کو ختم کر کے دینِ محمدیؐ کی تجدید فرمائی۔

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجددیت کا زندہ ثبوت یہی ہے کہ جتنے علماء ومحدثین وفقہاء نظر آرہے ہیں وہ سب انہی کی دَین ہے اور اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجددیت دیکھنے کے لیے عالمِ اسلام کے مدارس کا مشاہدہ کافی ہے؛ لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ ہر صدی کے مجددین کی اتباع کو لازم پکڑیں اور ان کے پیچھے چلیں۔

اصلاحِ معاشرہ

# امانت کی اہمیت اور حفاظت

ازقلم: مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی، استاذ مدرسہ عربیہ غیث الہدیٰ بنگلور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اخلاقِ حسنہ کی تاکید فرمائی ہے اور شریعت نے جن صفات کو لازمۂ ایمان قرار دیا ہے، اُن میں امانت بھی شامل ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی کوئی خطبہ ارشاد فرمایا، اُس میں ضرور امانت کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے فرمایا:

**لَاإِيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ، وَلَادِيْنَ لِمَنْ لَاعَهْدَ لَهُ.** (احمد عن انسؓ:۱۲۶۸)

''جس شخص میں امانت داری نہیں اُس میں ایمان نہیں اور جس میں معاہدہ کی پابندی نہیں اُس میں دین نہیں''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن پُل صراط کی ایک جانب امانت کھڑی ہوجائے گی، دوسری جانب صلہ رحمی کھڑی ہوگی اور لوگ پُل صراط پر سے گزریں گے الخ۔

(رواه مسلم عن حذيفةؓ في حديث طويل، كتاب الإيمان باب أدنىٰ اهل الجنة منزلة:١٩٥)

امانت کی حفاظت اور اس کی ادائیگی کی اہمیت مذکورہ روایت سے بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اگر کوئی امانت کی حفاظت نہیں کرتا، حقوق کی ادائیگی نہیں کرتا اور صلہ رحمی نہیں کرتا، تو امانت اور صلہ رحمی اللہ کے نزدیک شکایت کرتے ہوئے پُل صراط پر ہی اُسے جہنم میں گرادیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق کی علامتوں کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: منافق کے پاس امانت رکھی جائے، تو اس میں خیانت کرتا ہے۔ (رواه البخاري عن أبي هريرة، كتاب الإيمان، باب علامات المنافق:٣٣)

معلوم ہوا کہ امانت میں خیانت مؤمن کی صفت ہرگز ہونہیں سکتی، مؤمن کی شان امانت کی حفاظت اور سامنے والے کے اعماد واعتبار کو ختم کرنے کے بجائے اس کے اعتماد واعتبار کو تقویت پہنچانا ہے۔

اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی ممتاز صفات کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

**﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾** (المؤمنون:۸، المعارج:۳۲)

''ایمان (کامل) والے لوگ وہ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہد وپیمان کی حفاظت اور نگہبانی کرتے ہیں''۔

# النبی الصادق الامین

قبل از نبوت عرب کے کفر وشرک، ظلم وزیادتی، سفاکیت اور لوٹ مار کے بدترین دَور اور بدترین معاشرے میں بھی کفار عرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''الصادق الامین'' کے لقب سے پکارا کرتے تھے، آپ کی امانت داری کی وجہ سے لوگ آپ کے پاس امانتیں رکھواتے تھے، لوگوں کو بھروسہ تھا کہ آپ امانت کی مکمل حفاظت فرماتے ہیں اور آپ کے پاس امانت ضائع نہیں ہوتی۔

سفر ہجرت کے موقع پر لوگ آپ کے قتل وخون کے درپے تھے، اِن نازک لمحات میں بھی آپ کے پاس دشمنوں کی امانتیں ہیں اور ان امانتوں کو ان کے مالکوں تک پہنچانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر سفر ہجرت پر تشریف لے گئے، یہ ہے ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امانت داری۔

(رواه البيهقي عن عائشة في السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب ماجاء في ترغيب الأمانات:١٢٦٩٦)

ابوسفیان رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے سے پہلے شاہِ روم ہرقل کے دربار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نماز، صدقِ حدیث، پاکدامنی، ایفائے عہد اور امانت کا پاس ولحاظ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔(رواه البخاري عن ابن عباسؓ في حديث طويل، كتاب الجهاد والسير، باب دعاء النبي الناس:٢٩٤١) آپ کے دشمن بھی آپ کی امانت داری کے معترف ومداح تھے۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے شاہِ حبشہ کے دربار میں اسلام کی حقانیت، اسلام کی پاکیزہ تعلیمات وہدایات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پیش کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلہ رحمی، مخلوق کے ساتھ ہمدردی وخیرخواہی، ایفائے عہد وحفظ امانت کو بیان فرمایا تھا۔

(رواه أحمد عن أمّ سلمةؓ في حديث طويل:١٧٤٠)

حکیم لقمان سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ اس مقام پر (فضل وکمال، حکمت کی باتوں کی توفیق وغیرہ) کیسے پہنچے، فرمایا: سچی بات چیت، امانت کی ادائیگی اور غیرضروری اُمور سے احتراز کی برکت سے اللہ نے مجھے یہ مقام عطا فرمایا ہے۔

**مَالِكٌ، أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّهُ قِيلَ لِلُقْمَانَ: مَابَلَغَ بِكَ مَانَرٰى؟ يُرِيْدُوْنَ الْفَضْلَ، فَقَالَ لُقْمَانُ: صِدْقُ الْحَدِيْثِ وَأَدَاءُ الْأَمَانَةِ وَتَرْكُ مَالَايَعْنِيْ.** (موطا مالکؒ:٣٦٢٨)

سری سقطی رحمہا اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جس شخص کو چار صفات: صدقِ حدیث، حفظِ امانت، حلال روزی اور حسنِ اخلاق کی دولت حاصل ہوگئیں، اس کو دنیا وآخرت کی بھلائی حاصل ہوگئی۔ (شعب الایمان:٤٥٥٩)

# امانت داری ہمارے معاشرے کی خرابی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

**إِنَّ أَوَّلَ مَا تَفْقِدُوْنَ مِنْ دِيْنِكُمُ الْأَمَانَةَ، وَإِنَّ آخِرَ مَايَبْقٰى مِنْ دِيْنِكُمُ الصَّلَاةُ، وَلَيُصَلِّيَنَّ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ لَادِيْنَ لَهُمْ.** (مصنف عبدالرزاق، كتاب العيدين، باب تعاهد القرآن:٥٩٨١)

''سب سے پہلی صفت جس کو تم دنیا سے غائب پاؤ گے، وہ امانت ہے اور دینی اُمور میں آخری زمانے تک نماز کو پاؤ گے، لوگ نمازیں پڑھیں گے؛ لیکن دیانت وامانت کا پاس ولحاظ نہیں کرتے ہوں گے''۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے دو حدیثیں فرمائی ہیں، ایک حدیث کا مصداق مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے، دوسری حدیث کے مصداق کا انتظار کر رہا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امانت (اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے) لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے گی، لوگ قرآن اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو جانیں گے، پھر ان پر عمل پیرا ہوں گے (صحابۂ کرامؓ کی زندگی میں اس حدیث کے مصداق کو پالیا ہے)۔

دوسری بات آپ نے (رفع امانت کے بارے میں) ارشاد فرمائی کہ ایک وقت آئے گا کہ امانت دنیا سے اُٹھالی جائے گی، امانت کا اثر باقی رہ جائے گا جیسے آگ کی وجہ سے کوئی زخم جسم پر آئے اور مندمل ہوجانے کے بعد جسم کے اس حصے پر داغ کا اثر پڑ جاتا ہے، (کھال کا اصلی رنگ زائل ہوجاتا ہے، اور دھبہ بہت دنوں تک باقی رہتا ہے، اسی طرح امانت کی حقیقت ختم ہوجائے گی، ظاہری آثار باقی رہ جائیں گے)۔

**يُصْبِحُ النَّاسُ يَتَبَايَعُوْنَ، فَلَايَكَادُ أَحَدٌ يُؤَدِّي الْأَمَانَةَ، فَيُقَالُ: إِنَّ فِيْ بَنِيْ فُلَانٍ رَجُلًا أَمِيْنًا، وَيُقَالُ لِلرَّجُلِ: مَا أَعْقَلَهُ وَمَاأَظْرَفَهُ وَمَا أَجْلَدَهُ، وَمَا فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ.**

''لوگ کاروبار کریں گے، کوئی امانت دار نہیں ہوگا، لوگ کہا کریں گے: فلاں ملک میں فلاں شہر میں فلاں بستی میں ایک امانت دار شخص رہتا ہے (یعنی سب لوگ خائن ہوجائیں گے، خال خال ہی امانت دار پائے جائیں گے) لوگ کسی کی تعریف کرتے ہوئے کہیں گے: فلاں شخص کس قدر عقل منداور چالاک اور باہمت ہے؛ حالاں کہ اس کے دل میں ذرّہ برابر ایمان نہیں ہوگا''۔

(رواه البخاري عن حذيفةؓ، كتاب الرقاق، باب رفع الأمانة:٦٤٩٧)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ لَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا وَلَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا، يَظْهَرُ النِّفَاقُ، وَتُرْفَعُ الْأَمَانَةُ، وَتُقْبَضُ الرَّحْمَةُ، وَيُتَّهَمُ الْأَمِيْنُ، وَيُؤْتَمَنُ غَيْرُ الْأَمِيْنِ، أَنَاخَ بِكُمُ السَّرَفُ وَالْحُوْبُ، قَالُوْا: وَمَاالسَّرَفُ وَالْحُوْبُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: الْفِتَنُ كَأَمْثَالِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحُ الْإِسْنَادِ وَلَمْ يُخْرِجَاهُ بِهٰذِهِ السِّيَاقَةِ.

(التعليق من تلخيص الذهبي:٨٧٢٥ صحيح، واخرجه ابن حبان في صحيحه:٦٧٠٧)

''اگر تم ان اُمور کو جانتے جن کو میں جانتا ہوں، تو کم ہنستے اور زیادہ روتے، پھر ارشاد فرمایا: (عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ) نفاق ظاہر ہوجائے گا، (منافقین کھل کر سامنے آئیں گے، جیسے بعض نام نہاد مسلمان یہود کے ایجنٹ کھل کر اسلام کے خلاف بولتے ہیں، اسلامی اقدار کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی اسلام دشمنی کو ترقی اور روشن مستقبل کا لبادہ پہناتے ہیں) امانت کو اُٹھالیا جائے گا (موجودہ زمانے میں نہ حکمرانوں میں امانت نہ رعایا میں)، رحمت کو دلوں سے نکال لیا جائے گا، (لوگوں میں ہمدردی نہیں ہے، ہر ایک کو کمانے کی فکر ہے، تاجر، طبیب ہر ایک کو اپنی دنیا کی فکر لوگوں کی بے بسی، بے کسی اور محتاجگی سے ان کو کوئی لین دین نہیں)''۔

امانت دار پر الزام لگایا جائے گا، (سازشوں سے اس کو برطرف کیا جاتا ہے؛ اِس لیے کہ اگر یہ امانت دار شخص اپنے عہدے پر رہے گا، تو ہمیں خیانت کا موقع نہیں دے گا) خیانت کرنے پر اعتماد واعتبار کیا جائے گا، (خائن اپنے جھوٹے وعدوں، رشوتوں اور سازشوں سے اپنے کو امین باور کرائے گا) پھر ارشاد فرمایا: سرف اور حوب نہایت قریب ہوچکے ہیں، صحابہؓ نے عرض کیا، سرف اور حوب سے کیا مراد ہے؟ (اس لیے کہ سرف (فضول خرچی) اور حوب (گناہ) بظاہر مراد نہیں ہیں، اسی وجہ سے صحابہؓ نے دریافت کیا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فتنے اور آزمائشیں جو تاریک رات کی طرح ہوں گے (جس میں رسی اور سانپ کی پہچان مشکل ہوتی ہے، فتنوں اور آزمائشی دَور میں بھی حق وباطل کی پہچان دشوار ہوتی ہے)۔

مذکورہ احادیث کو سامنے رکھ کر غور کریں، احادیث کا ایک ایک لفظ ہمارے بگڑے ہوئے معاشرے پر صادق آتا ہے، سماج ومعاشرے میں امانت کا پاس ولحاظ تقریباً ختم ہوچکا ہے، اپنی نجی زندگی، معاشرتی اور معاملاتی زندگی، مالی امانتیں اور ذمہ داریوں کی تقسیم اور ذمہ داریوں کی ادائیگی غرض زندگی کے ہر شعبے میں

خیانت، دھوکہ دہی اور دغابازی بہت عام ہوچکی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق نماز، روزہ اور کچھ ظاہری دین داری نظر آتی ہے؛ پر امانت داری کا پاس ولحاظ ان ظاہری دین داروں کے پاس بھی نہیں، چہ جائے کہ بے دین لوگوں سے اس کی شکایت کی جائے۔

ہمارے معاشرے میں ''امانت دار'' لوگوں کی نگاہوں میں معتوب ہوتا ہے، خائن محبوب ہوتا ہے، امانت دار پر شک کیا جاتا ہے، بھگوڑوں پر بھروسہ کیا جاتا ہے، دھوکہ باز کو چالاک سمجھا جاتا ہے، امانت دار کو بھولا بھالا اور نادان کہا جاتا ہے، دنیا کے متاعِ قلیل کے لیے ہر طرح کی امانت میں خیانت کرگزرتے ہیں، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیثیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر بار بار پڑھیں، صبحِ روشن کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ہم پر صادق اور منطبق ہوتی ہوئی نظر آئیں گی۔

## امانت کا وسیع مفہوم

لفظ امانت کے لغوی معنیٰ ہر اُس چیز کو شامل ہے جس کی ذمہ داری کسی شخص نے اُٹھائی ہو اور اس پر اعتماد وبھروسہ کیا گیا ہو۔

صاحب ''لسان العرب'' ابنِ منظورؒ فرماتے ہیں:

''لفظ ''امانت'' امن سے مشتق ہے، جس کا معنیٰ ہے مطمئن اور مامون کرنا، امانت کو امانت اس لیے کہا جاتا ہے کہ امانت والا شخص ایذا رسانی، حق تلفی وکوتاہی اور حقوق کی ادائیگی اور شئ مامون کے ضائع ہونے سے متعلق امانت رکھنے والے کو مطمئن ومامون کردیتا ہے، اس وجہ سے امانت کو امانت کہا جاتا ہے۔

لفظ ''امانت'' کا استعمال اطاعت وعبادت (تکالیفِ شرعیہ)، اعتماد واعتبار اور حفاظت کے معنیٰ ہوتا ہے اور احادیث میں لفظ امانت کو مذکورہ معانی میں استعمال کیا گیا ہے''۔

(لسان العرب، حرف النون، فصل الالف: ۱۳/۲۲)

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہٗ العالی تحریر فرماتے ہیں:

''عربی زبان میں ''امانت'' کا معنیٰ یہ ہے کہ کسی شخص پر کسی معاملے میں بھروسہ کرنا؛ لہٰذا ہر وہ چیز جو دوسرے کو اِس طرح سپرد کی گئی ہو کہ سپرد کرنے والے نے اس پر بھروسہ کیا ہو کہ یہ اس کا حق ادا کرے گا، امانت کی حقیقت ہے، امانت کی اس حقیقت کو سامنے رکھیں گے، تو امانت کے مفہوم میں بے شمار چیزیں داخل ہوں گی''۔ (اسلام اور ہماری زندگی: ۳۵/۸)

حضرت مولانا مفتی شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا، وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا''. (النساء:۵۸)

ترجمہ: بے شک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچادو امانتیں امانت والوں کو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں، تو فیصلہ کرو انصاف سے، اللہ اچھی نصیحت کرتا ہے تم کو بے شک اللہ ہے سننے والا دیکھنے والا۔

حضرت مفتی شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر کے اختتام میں بطور خلاصہ تحریر فرماتے ہیں:

اس جگہ یہ بات غور طلب ہے کہ قرآنِ حکیم نے لفظ ''امانت'' بصیغہ جمع استعمال فرمایا، جس میں اشارہ ہے کہ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی کا کوئی مال کسی کے پاس رکھا ہو، جس کو عام طور پر امانت کہا اور سمجھا جاتا ہے؛ بلکہ امانت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں جو واقعہ آیت کے نزول کا ابھی ذکر کیا گیا خود اس میں بھی کوئی مالی امانت نہیں، بیت اللہ کی کنجی کوئی خاص مال نہ تھا؛ بلکہ یہ کنجی خدمت بیت اللہ کے ایک عہدے کی نشانی تھی۔ (معارف القرآن:۴۴۶/۲)

امانت کی بے شمار قسمیں ہیں؛ اِسی لیے لفظ امانت کو مصدر ہونے کے باوجود (قرآنِ پاک میں کئی مقامات پر) جمع کے صیغے کے ساتھ لایا گیا ہے؛ تاکہ امانت کی سب قسموں کو شامل ہوجائے خواہ وہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں، یا حقوق العباد سے، حقوق اللہ سے متعلق امانات تمام شرعی فرائض وواجبات کا ادا کرنا اور تمام محرمات ومکروہات سے پرہیز کرنا ہے۔

حقوق العباد سے متعلق امانت میں مالی امانت کا داخل ہونا، تو معروف ومشہور ہے کہ کسی شخص نے کسی کے پاس اپنا کوئی مال امانت کے طور پر رکھ دیا یہ اس کی امانت ہے، اس کی حفاظت اس کے واپس کرنے تک اس کی ذمہ داری ہے۔ (معارف القرآن، المؤمنون، آیت:۸، ۳۹۸/۶)

# امانت کی قسمیں

## امتثالِ اوامر واجتنابِ مناہی (تکالیفِ شرعیہ):

اللہ تعالیٰ نے ''یوم السبت'' میں انسانوں سے اپنی ربوبیت، اطاعت وفرماں برداری کا اقرار لیا، اس عہد کو اللہ تعالیٰ نے ''امانت'' سے تعبیر فرمایا ہے:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ، فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ (الاحزاب:۷۲)

''ہم نے آسمان، زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی، انہوں نے اِس امانت کو اُٹھانے سے انکار کردیا اور اِس امانت (کے بوجھ) سے ڈر گئے، انسان نے اس امانت کو اُٹھالیا، یہ انسان بڑا ظالم وجاہل ہے''۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی مذکورہ آیت کی تفسیر کا خلاصہ قرطبیؒ اور ابنِ کثیرؒ سے نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

امانت پیش کرنے سے مراد دین کے احکام کو پیش کرنا ہے۔ (تفسیر قرطبی:۱۴/۲۵۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان اور پہاڑوں پر دین کے احکام پیش کیے، ان سے کہا کہ اگر تم اس امانت کو اُٹھالو، تو اللہ کی فرماں برداری کرنے کی صورت میں تم کو بہترین اجر دیا جائے گا اور نافرمانی کرنے کی صورت میں زبردست سزا دی جائے گی۔

اس امانت میں اللہ کی توحید اور اس کی عبادت یقینی طور پر شامل رہی ہوگی، رہ گئے دوسرے احکام، تو وہ ہر مخلوق کو اس کی ساخت اور صلاحیت کے اعتبار سے دیے جاتے ہیں، ضروری نہیں ہے کہ ان کے لیے وہی شرعی احکام ہوتے جو انسانوں کے لیے ہیں، بہرحال ان مخلوقات نے اپنے عجز کا اظہار کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اس امانت کو اُٹھانے کی ذمہ داری نہیں رکھی۔

پھر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان سے کہا: میں نے یہ امانت آسمان وزمین پر پیش کی، تو انھوں نے اس سے عاجز ہونے کا اظہار کردیا، کیا تم اس کو اُٹھا سکتے ہو؟ اگر تم اس کو اُٹھانے کا حق ادا کروگے، تو تمہیں اس کا بہترین اجر عطا کیا جائے گا اور اگر تم نے اس امانت کا حق ادا نہیں کیا، ضائع کردیا، تو تم کو عذاب ہوگا، حضرت آدم علیہ السلام نے اس کو قبول فرمالیا۔ (تفسیر ابنِ کثیر:۳/۵۰۱) اس طرح دین وشریعت کے احکام انسان کے کاندھوں پر رکھے گئے۔

انسان کے بڑے ظالم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس امانت کو قبول کرکے اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے؛ کیوں کہ اگر اس کا حق ادا نہ کرسکا، تو دوزخ میں جائے گا اور جاہل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے جس ذمہ داری کو قبول کیا ہے، وہ اس کی مشکلات سے کماحقہٗ واقف نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہما اللہ نے ظالم اور جاہل ہونے کا یہی مطلب مراد لیا ہے۔ (تفسیر قرطبی:۱۴/۲۵۷)

اگرچہ کہ اس فقرے میں بظاہر انسان کی مذمت ہے؛ لیکن غور کیا جائے، تو اس کے پسِ پردہ انسان کی تعریف بھی کی گئی ہے، ظالم اسی کو کہا جاتا ہے، جس میں عدل وانصاف کرنے کی صلاحیت ہو، گائے بکری اور درودیوار کو ظالم نہیں کہا جاتا، جاہل اسی کو کہا جاتا ہے، جس میں اپنی اصل کے اعتبار سے علم کی صلاحیت ہو، سمندر

اور پہاڑ کو جاہل نہیں کہا جاتا، اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے اس بات کا اعلان ہے کہ اس کو علم وعدل کی صلاحیت عطا کی گئی ہے اور یہی صلاحیت ہے، جس کے ذریعہ انسان امانتِ الٰہی کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے۔
(آسان تفسیر: ۳۴۸/۲)

# زندگی امانت

علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

امانت کی بے شمار قسمیں ہیں، حقوق اللہ میں امانت کی رعایت یہ ہے کہ تمام اوامر کو بجالائے اور محرمات اور معاصی سے احتراز کرے، یہ باب بہت وسیع ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہر چیز میں امانت کی رعایت لازم ہے، حتیٰ کہ وضو، غسل، نماز، روزہ اور زکوٰۃ ہر چیز کو اس کے شرائط، واجبات اور آداب کے ساتھ ادا کرنا یہ امانت کی رعایت، مذکورہ اُمور کی رعایت نہ کرنا یہ خیانت ہے۔

انسانی اعضاء انسان کے پاس امانت ہیں، زبان کی امانت یہ ہے کہ جھوٹ، غیبت، چغل خوری، بدگوئی، بہتان تراشی، شرکیہ اور کفریہ کلمات سے زبان کی حفاظت کرے، آنکھ کی حفاظت یہ ہے کہ اس کو محرمات کی طرف دیکھنے سے بچائے۔ حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیٹی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نگاہوں کی حفاظت ہی کی بنا پر ان کے امین ہونے کی گواہی دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھوں کی خیانت سے اللہ کی پناہ طلب کی ہے، چپکے سے محرمات کی طرف دیکھنا، بلا اجازت کسی کے گھر وغیرہ میں جھانکنا، کسی کے ذاتی قسم کے خطوط وغیرہ بلا اجازت پڑھنا یہ آنکھ کی خیانت ہے، کان کی امانت یہ ہے کہ لہو ولعب، گانا، موسیقی وغیرہ کے سننے سے بچائے، اسی طرح تمام انسانی اعضاء کا حکم ہے۔ (التفسیر الکبیر، ورۃ النساء، آیت: ۵۸: ۱۰/۱۱۰)

زندگی ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے، اس امانت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کو اللہ کے حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے مطابق گزاریں، انسان کی زندگی، اس کا وجود، اس کیا عضاء وجوارح، اس کے اوقات، اس کے اموال، اس کی صلاحیتیں اور توانائیں سب اللہ کی امانت ہیں، زندگی، اعضاء، اموال، اوقات اور توانائیں اور صلاحیتوں کو اسی کام میں استعمال کرنا ضروری ہے، جس کام کے لیے یہ نعمتیں دی گئی ہیں، دیگر کاموں میں استعمال کرنا امانت کی خیانت ہے۔ (ملخص: اسلام اور ہماری زندگی: ۷۳/۸)

انسان کی جان امانت ہے؛ اِسی لیے شریعت میں خودکشی کرنا حرام ہے، اگر یہ جان وجسم اپنا ہوتا، تو خودکشی حرام کیوں ہوتی؟ معلوم ہوا کہ یہ جان وجسم اپنا نہیں؛ بلکہ امانت ہے۔

# مالی امانتیں

مالی امانت کو فقہ کی اصطلاح میں ودیعت کہتے ہیں، ودیعت کہتے ہیں کہ کوئی شخص بالقصد کسی کے پاس امانت رکھے، اور امانت عام ہے، بالقصد رکھے یا کسی اور طریقہ سے کسی بھی شخص کا کوئی بھی مال ہمارے پاس آجائے، خواہ مالک خود ہمارے پہنچائے کہ یہ چیز اپنی حفاظت اور ذمہ داری میں رکھو، یا کسی اور طریقے پر ہمارے پاس پہنچ گئی ہو، مثلاً کوئی چیز ہوا میں اُڑ کر آ گئی، یا کسی سے چھوٹ گئی، آپ کی نظر اس چیز پڑی، اب وہ چیز آپ کے پاس امانت ہے، اس کی حفاظت کرنا اور مالک تک پہنچانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہے، اس کی حفاظت نہ کرنا، یا ذمہ داری میں ہونے کی صورت میں اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرنا یہ خیانت ہے۔

(مستفاد قاموس الفقہ :۲/۲۴۴)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"اَلْقَبْلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُكَفِّرُ الذُّنُوْبَ كُلَّهَا أَوْ قَالَ: يُكَفِّرُ كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا الْأَمَانَةَ".

اللہ کے راستے کی شہادت سے ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے؛ البتہ امانت معاف نہیں کی جاتی، قیامت کے دن صاحبِ امانت کو لایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اس کی امانت کو ادا کرو، وہ شخص کہے گا، اے اللہ! دنیا کا نظام ختم ہو چکا ہے، امانت کہاں سے لاؤں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کو "ہاویہ" جو جہنم کا ایک طبقہ ہے، اسے وہاں لے جا کر ڈال دو، جب اس کو "ہاویہ" میں پہنچایا جائے گا، تو اس کو وہ امانت بعینہٖ ہاویہ میں نظر آئے گی، وہ شخص اُس امانت کو لے کر جہنم کے نیچے حصے سے اُوپر تک آئے گا اور سمجھ رہا ہوگا کہ وہ تو باہر نکل ہی جائے گا، اچانک وہ امانت گہرائی میں گر جائے گی، اُس کے پیچھے یہ شخص بھی گر جائے گا، یہی سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا، (ایمان والا ہوگا، تو ان شاء اللہ کسی وقت نکلے گا) پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بطور دلیل سورۃ النساء کی آیت پڑھی۔ (السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتب الودائع، باب ماجاء في ترغيب أداء الأمانات: ۱۲۶۹۲، حلية الاولياء، مكارم الاخلاق للخرائطي)

**نوٹ:** مسلم ترمذی وغیرہ حدیث کی کتابوں میں قرض کے سلسلے میں یہ بات آئی ہے کہ شہادت سے ہر قسم کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں؛ البتہ قرض معاف نہیں ہوگا، اس روایت کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں اور یہ روایت مختصر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "امانت" سے متعلق روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے، بعض نے

مرفوعاً روایت کی ہے، بعض حضرات موقوفاً چوں کہ روایت عذاب سے متعلق ہے، اس وجہ سے موقوف روایت بھی مرفوع ہی کے درجے میں ہوگی؛ نیز امانت میں خیانت کی جائے، تو امانت امین کے ذمے قرض ہوگئی؛ لہٰذا ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض اور سند کے اعتبار سے کوئی کلام نہیں ہوگا۔

امانت کا حکم یہ ہے کہ اگر امانت کی چیز امین کے قبضے میں رہتے ہوئے اس کی زیادتی اور قصد وارادہ کے بغیر ضائع ہوجائے، تو امین اس چیز کا ضامن نہ ہوگا، امین سے امانت کے ضائع ہوجانے کی وجہ سے اس کا تاوان اور جرمانہ وصول نہیں کیا جائے گا، اگر امین کی طف سے زیادتی ہو، بدنیتی، غفلت یا خاطر خواہ حفاظت کا انتظام نہ کرے، تو وہ اس کا ضامن اور ذمہ دار قرار پائے گا۔ (قاموس الفقہ :۲/۲۲۴)

## عاریت کی چیز امانت

امانت کے کچھ خاص شعبے بھی ہیں، بعض اوقات ہم ان کو امانت نہیں سمجھتے اور امانت جیسی حفاظت نہیں کرتے، مثلاً عاریت، عاریت کہتے ہیں، کسی آدمی سے کسی چیز کو عارضی طور سے بلاعوض استعمال کرنے کے لیے لی جائے، (قرآن، سنت اور اجماع سے کسی چیز کو عاریت پر لینے کی گنجائش ہے اور بسا اوقات اس کی ضرورت معاشرے میں پیش آہی جاتی ہے) جو شخص کسی دوسرے سے کتاب، برتن، سواری یا کوئی اور چیز استعمال کے لیے لے، تو عاریت کی چیز لینے والے کے نزدیک امانت ہے، عاریت پر لی ہوئی چیز کا استعمال مالک کی مرضی اور اس کی اجازت کے حدود ہی میں کرسکتا ہے اور وقت مقررہ پر واپس کردینا یہ امانت داری ہے، مالک کی مرضی کے خلاف استعمال کرنا، طے شدہ وقت پر واپس نہ کرنا، خیانت ہے۔ (مستفاد: اسلام اور ہماری زندگی: ۸/۴۰)

**عَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِي الْخُطْبَةِ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ: اَلْعَارِيَةُ مُؤَدَّاةٌ، وَالزَّعِيْمُ غَارِمٌ، وَالدَّيْنُ مَقْضِيٌّ.**

(رواه الترمذي كتاب البيوع، العارية مؤداة:١٢٦٥)

''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے سال تقریر میں یہ باتیں فرماتے ہوئے سنا کہ عاریت ادا کی جائے گی، ضامن ادائیگی کا ذمہ دار ہے اور قرض ادا کیا جائے گا''۔

حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

اِس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے میں پائی جانے والی تین خرابیوں کی اصلاح فرمائی ہے۔

عاریت ادا کی ہوئی ہے (یعنی عاریت کی ادائیگی لازم ہے) معاشرے میں یہ خرابی پائی جاتی ہے کہ پڑوس سے کوئی چیز مانگ لاتے ہیں، پھر واپس نہیں کرتے، اگر مالک بھول گیا، تو اس کی چیز گئی؛ ورنہ جب مانگنے آئے گا، منہ بنا کر دیں گے، یہ طریقہ غلط ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمایا کہ جب ضرورت پوری ہوجائے، تو فوراً وہ چیز شکریہ کے ساتھ واپس کردو۔ (تحفۃ الألمعی:۱۹۲/۴)

## منصب اور عہدے اللہ کی امانتیں

حکومت کے جتنے عہدے اور منصب ہیں، وہ سب اللہ کی امانت ہیں، جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں، جن کے ہاتھ میں عزل ونصب کے اختیارات ہیں، ان کے لیے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کردیں، جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں ہے؛ بلکہ ان پر لازم ہے کہ ہر کام اور ہر عہدے کے لیے اپنے دائرہ حکومت میں اس کے مستحق کو تلاش کریں۔ (معارف القرآن، النساء:۶۴۴/۲)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ مجھے کسی جگہ کا حاکم مقرر فرمادیں، تو آپ نے میرے مونڈھے پر ہاتھ رکھا اور ارشاد فرمایا:

**يَـا أَبَاذَرٍّ، إِنَّكَ ضَعِيْفٌ، وَإِنَّهَا أَمَانَةُ، وَإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ، إِلَّا مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا، وَأَدَّى الَّذِيْ عَلَيْهِ فِيْهَا.** (رواه مسلم عن أبي ذر كتاب الأمارة باب كراهية الأمارة:١٨٢٥)

''اے ابوذر! آپ ضعیف آدمی ہیں اور منصب ایک امانت ہے جس کی وجہ سے قیامت کے دن انتہائی ذلت اور رسوائی ہوگی، سوائے اس شخص کے جس نے امانت کا حق پورا کردیا ہو، یعنی وہ ذلت سے بچ جائیگا''۔

## کسی منصب پر غیر اہل کو بٹھانے والا ملعون

کامل اہلیت والا سب شرائط کا جامع کوئی شخص نہ ملے، تو موجودہ لوگوں میں قابلیت اور امانت داری کے اعتبار سے جو سب سے زیادہ فائق ہو، اس کو ترجیح دی جائے گی، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی ہو، پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی وتعلق کی مد میں بغیر اہلیت معلوم کیے ہوئے دے دیا، اس پر اللہ کی لعنت ہے، نہ اس کا فرض مقبول ہے نہ نفل؛ یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہوجائے۔ (جمع الفوائد:۵۲۳)

بعض روایات میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا؛ حالاں کہ اس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اس عہدے کے لیے اُس سے زیادہ قابل اور اہل ہے، تو اسنے اللہ کی خیانت کی اور رسول کی اور سب مسلمانوں کی، آج جہاں نظامِ حکومت کی ابتری نظر آتی ہے، وہ سب اس قرآنی تعلیم کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ تعلقات، سفارشوں اور رشوتوں سے عہدے تقسیم کیے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نااہل اور نا قابل لوگ عہدوں پر قابض ہو کر خلقِ خدا کو پریشان کرتے ہیں اور سارا نظام حکومت برباد ہو جاتا ہے۔

اسی لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

**إِذَا ضُيِّعَتِ الْأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ، قَالَ: كَيْفَ إِضَاعَتُهَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: إِذَا أُسْنِدَ الْأَمْرُ إِلٰى غَيْرِ أَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ.**

(رواه البخاري عن أبي هريرة، كتاب الرقاق، باب رفع الأمانة:٦٤٩٦)

''جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کر دی گئی جو اس کام کے اہل اور قابل نہیں تو (اب اس فساد کا کوئی علاج نہیں) قیامت کا انتظار کرو''۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے لفظ ''امانات'' بصیغہ جمع لا کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ امانت صرف اسی کا نام نہیں کہ ایک شخص کا مال کسی دوسرے شخص کے پاس بطور امانت رکھا ہو؛ بلکہ امانت کی بہت سی قسمیں ہیں، جن میں حکومت کے عہدے بھی داخل ہیں۔ (معارف القرآن، النساء:۴۴۷/۲)

اس آیت میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس میں حق جل شانہٗ نے حکومت کے عہدوں کو بھی امانت قرار دے کر اوّل تو یہ واضح فرما دیا کہ جس طرح امانت صرف اسی کو ادا کرنا چاہیے جو اس کا مالک ہو، کسی فقیر، مسکین پر رحم کھا کر کسی کی امانت اس کو دینا جائز نہیں، یا کسی رشتہ دار یا دوست کا حق ادا کرنے کے لیے کسی شخص کی امانت اس کو دے دینا درست نہیں، اسی طرح حکومت کے عہدے جن کے ساتھ عام خلقِ خدا کا کام متعلق ہوتا ہے، یہ بھی امانتیں ہیں اور ان امانتوں کے مستحق صرف فہ لوگ ہیں جو اپنی صلاحیت، قابلیت اور استعداد کے اعتبار سے بھی اس عہدے کے لیے مناسب اور موجودہ لوگوں میں سب سے بہتر ہوں اور دیانت اور امانت کے اعتبار سے بھی سب میں بہتر ہوں، ان کے سوا کسی دوسرے کو یہ عہدہ سپرد کر دیا، تو یہ امانت ادا نہ ہوئی۔ (معارف القرآن:۴۴۹/۲)

جس طرح حکومت کے مناصب امانت ہیں، اسی طرح تمام غیر سرکاری ادارے، تنظیمیں اور اوقافی اَملاک مدارس اور مساجد کی ذمہ داریوں کا بھی یہی حکم ہے۔ (ابو فیضان)

## ملازمت کے اوقاتِ امانت

مزدور اور ملازم کو جو کام سپرد کیا گیا، اس کے لیے جتنا وقت خرچ کرنا باہم طے ہو گیا، اس میں اس کام کو پورا کرنے کا حق ادا کرنا اور مزدوری اور ملازمت کے لیے جتنا وقت مقرر ہے، اس کو اسی کام میں لگانا بھی امانت ہے، کام کی چوری یا وقت کی چوری خیانت ہے۔ (اسلام اور ہماری زندگی: ۴۱/۸)

## مجلسیں امانت ہیں

مجلس میں جو بات کہی جائے، وہ اس مجلس کی امانت ہے، اہلِ مجلس کی اجازت کے بغیر مجلس کی باتوں کو دوسروں سے نقل کرنا اور پھیلانا جائز نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

**عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ الْحَدِيثَ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِيَ أَمَانَةٌ.** (الترمذي، أبواب البر والصلة: ۱۹۵۹)

''جب کوئی شخص کسی سے کوئی بات کہے، پھر وہ چلا جائے، تو وہ بات سننے والے کے نزدیک امانت ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے، کسی کے سامنے اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر بیان نہ کرے، اگر بیان کر دے، تو خیانت ہوگی''۔

مجلسیں امانت ہیں، یعنی راز کی بات امانت ہے، اس کا اظہار خیانت ہے، مجلس میں کسی نے کوئی ضروری بات کہی، قرائن یہ بتاتے ہیں، بعض مرتبہ کہنے والا بذاتِ خود صراحت کرتا ہے کہ ان باتوں کو کسی سے بیان نہ کرو، کہنے والے نے حاضرین پر اعتماد کیا، بھروسہ کیا کہ یہ اہلِ مجلس میرے قابل اعتبار لوگ ہیں، میرے رازدار ہیں اور ان باتوں کو ظاہر کرنے میں اس کا نقصان ہے۔

اگر اہلِ مجلس میں سے کسی نے ظاہر کر دیا، تو ممکن ہے اس کی باتوں کو ظاہر کرنے سے نقصان برداشت کرنا پڑے؛ نیز اس نے اہلِ مجلس کو قابلِ اعتبار گردانا تھا، بھروسہ کیا، اس کے دل میں آپ کا اعتبار اور بھروسہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا؛ لہٰذا کسی نے کوئی راز کی بات کسی سے کہی، وہ بھی اس کی امانت ہے، بغیر اذنِ شرعی کسی کا راز ظاہر کرنا امانت میں خیانت ہے۔

نیز زوجین کا تنہائی کی باتوں کو اپنے دوست یا سہیلیوں کے سامنے ذکر کرنا، اللہ کے نزدیک نہایت

ناپسندیدہ ہے، بعض حضرات دل لگی اور خوش طبعی کے نام پر زوجین کی تنہائی کی باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، یہ عمل اللہ کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا امانت داری کا بھی تقاضا ہے اور حیا کا بھی۔

**قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ مِنْ أَعْظَمِ الْأَمَانَةِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، اَلرَّجُلَ يُفْضِيْ إِلَى امْرَأَتِهٖ، وَتُفْضِيْ إِلَيْهِ، ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا.**

(رواه مسلم عن أبي سعيد الخدري، كتاب النكاح، باب تحريم افشاء سر المرأة:١٤٣٧)

البتہ کسی نے ناحق خون کرنے، بدکاری یا کسی کا مال لوٹنے اور چوری کرنے کی بات کہی ہے، تو جس کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا گیا، اس کو مطلع کردے؛ تاکہ اس کی جان، مال اور عصمت کی حفاظت ہوسکے اور اس کو نقصان سے بچایا جاسکے، شرعی اعذار کی بنا پر مجلس کی باتیں ظاہر کی جاسکتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

**اَلْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ إِلَّا ثَلَاثَةَ مَجَالِسَ: سَفْكُ دَمٍ حَرَامٍ، أَوْ فَرْجٌ حَرَامٌ، أَوْ اقْتِطَاعُ مَالٍ بِغَيْرِ حَقٍّ.** (رواه أبو داد عن جابرؓ، كتاب الآداب:٤٨٦٩)

## صاحبِ مشورہ امین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

**اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ.** (رواه أبوداؤد عن أبي هريرة، كتاب الآداب:٥١٢٨)

یعنی جس شخص سے کوئی مشورہ لیا جائے، وہ امین ہے، اس پر لازم ہے کہ وہی مشورہ دے جو اس کے نزدیک مشورہ لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو، اگر جانتے ہوئے اس کی مصلحت کے خلاف مشورہ دیا، تو امانت میں خیانت کا مرتکب ہوگیا۔

**قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ أَشَارَ عَلٰى أَخِيْهِ، وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّ غَيْرَهُ أَرْشَدُ، فَقَدْ خَانَهُ.** (مكارم الأخلاق للخرائطي:٧٨٢)

## خلاصۂ کلام

**﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا، وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾** (النساء:٥٨)

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمَانٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

(الانفال:۲۷)

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾ (المؤمنون:۸،المعارج:۳۲)

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی لکھتے ہیں:

غرض یہ ہے کہ امانت میں خیانت کے مصداق اتنے ہیں کہ شاید زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں ہمیں امانت کا حکم نہ ہو اور خیانت سے ہمیں روکا نہ گیا۔(اسلام اور ہماری زندگی:۵۰/۸)معلوم ہوا کہ امانت کا مفہوم نہایت وسیع اور زندگی کے تمام شعبوں و گوشوں کو محیط ہے۔

قابلِ احترام بزرگو! بندۂ ناچیز نے امانت سے متعلق چند مذکورہ اسلامی تعلیمات وہدایات، تاکیدات اور خیانت پر سخت قسم کی وعیدیں جمع کی ہیں، ان کو اپنانے میں ہماری دنیا وآخرت کی بھلائی اور نجات ہے، دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اوّلاً ان سطور کو جمع کرنے والے کو اور ثانیاً تمام امتِ مسلمہ کو زندگی کے ہر شعبے میں امانت کا پاس ولحاظ کرنے کی توفیق نصیب فرمائے اور خیانت سے حفاظت فرمائے، آمین یارب العالمین۔

تذکرۂ اولیاء

# راہِ عزیمت کے مسافر مفکر اسلام مولانا سید محمد ولی رحمانی

ازقلم: مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی صاحب، سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

بھاری بھرکم بدن، قامت میانہ مائل بہ درازی، رنگ سرخ وسپید، پیشانی کشادہ، نورِ الٰہی سے چمکتی ہوئی، آنکھیں تیز بھی معنی خیز بھی، کچھ بولتی کچھ سوچتی ہوئیں، ہاتھ میں عصا، عام عصا سے ضخامت میں دوگنا، سہ گنا، مرعوب کن اور دہشت ناک، خوش لباس، خوش مزاج، داڑھی سفید، سینے پر پھیلی ہوئی، ذکرِ الٰہی کے نور سے چہرہ اس قدر منور کہ دل سے بے اختیار یہ تمنا نکلتی ہے کہ ؎

من بہ رخ تو دیدہ باشم ❖ تو درون من دیدہ باشی

خطابت میں یگانہ، تحریر وتصنیف میں منفرد، سیاست میں یکتا، روحانیت میں بے مثل، ذہانت وذکاوت میں طاق، شرافت نسبی، اور للّٰہیت ان کا موروثی سرمایہ ہے۔ ذاتی قابلیت اور استعداد ان پر مستزاد۔ یہ ہیں عالم اسلام کے نامور پیر طریقت، خانقاہِ رحمانی کے سجادہ نشین، اسلاف کی پاکیزہ روایات کے امین، لاکھوں انسانوں کے مرشد گرامی، ہندوستانی مسلمانوں کے صف اول کے قائد ''بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی'' حضرت مولانا محمد ولی رحمانی ؎

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں و رزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیز ے دیگری

حضرت مولانا سرتاسر خدمت ہیں۔ ایثار وہمت کا مجسمہ، بے لوث وبے غرض قربانی کا مرقع، وہ استقامت کے پہاڑ ہیں۔ صرصر کی موجیں اور طوفان کے دھارے انہیں اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتے۔ ترغیب وترہیب کا کوئی وار اُن کے قدموں میں ہلکی سے جنبش بھی نہیں پیدا کرسکا، ناسازگار حالات اور ناموافق فضا میں اپنا چراغ جلانا اور جلائے رکھنا انہیں خوب آتا ہے۔ ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش حق نے جس کو دیے ہیں اندازِ خسروانہ

ان کا وجود صرف ان کے مریدین ومعتقدین اور خانقاہ رحمانی کے متوسلین کے لیے ہی نہیں؛ بلکہ تمام

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مضبوط سہارا ہے۔ع

ہے غنیمت کہ فروزاں ہیں ابھی چند چراغ

ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ڈرنا اور سہمنا نہیں جانتے۔حق گوئی اور بے باکی ان کا طرۂ امتیاز ہے عام قائدین کی طرح بات چھپا کے نہیں رکھتے جو دل میں ہوتا ہے توپ کے گولے کی طرح داغ دیتے ہیں معاملہ صدر مملکت کا ہو یا کسی وزیر یا تدبیر کا ان کی زبان وہی کہتی ہے جو وہ سچ سمجھتے ہیں۔لوگ بند کمروں میں احتیاط اور دبی زبان سے جو کہتے ہیں وہ برسر عام بلا روک ٹوک اسی بات کا اظہار کرتے ہیں وہ اور ہوں گے جن کا طرزِ عمل شاعر کی زبان میں یہ ہے ؎

معشوق ما بہ شیوہ ہر کس موافق است ❖ باما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

ان کا ایمان وعمل تو ''أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر'' پر ہے ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش

میں زہر ہلاہل کو بھی کہہ نہ سکا قند

برسوں پیچھے لوٹ جایئے! بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ پیش آیا، اس کے بعد پورا ملک فسادات کی لپیٹ میں آ گیا، مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے، پھر اچانک حالات نے پلٹا کھایا بمبئی میں خوفناک بم دھماکے ہوئے، حالات کی نزاکت کے پیش نظر مسلم قائدین کو چپ سی لگ گئی، صرف ایک آواز، بلند اور کراری آواز، بلند ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں چھا گئی ''بمبئی کے بم دھماکوں نے فرقہ پرستی کے بخار کو کم کیا ہے'' اور یہ کہ ''عوامی دہشت گردی بُری ہے اور سرکاری دہشت گردی انتہائی خطرناک'' اور یہ آواز سوائے حضرت مولانا کے اور کس کی ہو سکتی ہے؟

چند برسوں قبل جب مرکزی وزارتی گروپ کی رپورٹ سامنے آئی اور مدارس کو دہشت گردی کے مراکز بتایا گیا تو اس وقت کے وزیرِ اعظم اٹل بہاری واجپائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حضرت مولانا نے کہا تھا ''آزادی کے بعد سے لے کر آج تک اگر کسی مدرسے میں دہشت گردی کا کوئی واقعہ ہوا ہو تو بتلایئے اور کسی سرکاری یونیورسٹی کا نام بتلایئے جہاں ہر سال دہشت گردی کا واقعہ نہ ہوتا ہو اور ۳۰۲ کا کیس نہ چلتا ہو'' اور جب اسی رپورٹ کے سلسلے میں وزیرِ اعظم نے منافقانہ روِش اختیار کی تو حضرت مولانا کا سخت بیان اخبارات میں شائع ہوا، جس کا عنوان تھا: ''وزیرِ اعظم لفظوں کی بازیگری کر رہے ہیں'' اور ابھی حال میں جب جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے داڑھی ٹوپی کے متعلق نیش زنی کی تو انہوں نے صدر جمہوریہ، مرکزی وزراء، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج حضرات اور سرکاری عہدیداران سے بڑا تیکھا سوال کیا، ان کا سوال تھا: ''میری داڑھی تو جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے صاف کر دی وزیرِ اعظم من موہن سنگھ کی داڑھی کون صاف کرے گا؟''

حضرت مدظلہم بافیض مرشد اور صاحبِ نسبت بزرگ ہیں، خانوادۂ سادات سے آپ کا تعلق ہے، سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ آپ کے جدامجد ہیں، آپ کے والد بزرگوار امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی (بانی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) اپنے دَور کے عبقری عالم، دُور اندیش اور صاحبِ بصیرت فقیہ اور اولیاءِ کاملین میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے، آپ کے دادا محترم حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ (خلیفہ ارشد حضرت مولانا شاہ فضل رحماں گنج مرادآبادیؒ) اپنے عہد کے نابغہ روزگار عالم دین، صاحبِ سیف وقلم بزرگ، اور منصب قطبیت پر فائز تھے، ہمارے حضرت دامت برکاتہم ان ہی بلند اوصاف اسلاف کے صحیح وارث اور سچے جانشین ہیں۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ اپنے بلند مرتبہ آباء واجداد کی عظمتوں کو قائم رکھا؛ بلکہ ان میں اضافہ بھی کیا۔ جامعہ رحمانی کی تعلیمی ترقی، خانقاہِ رحمانی کے دائرۂ خدمت کی وسعت، رحمانی فاؤنڈیشن کا قیام، رحمانی تھرٹی کا اجراء آپ کا مرہونِ منت ہے اور آج بھی جب کہ پیرانہ سالی ضعف اور مختلف عوارض آپ کو لاحق ہو چکے ہیں اور عمر مبارک ۶۹ رسال سے متجاوز ہو چکی ہے تحفظِ دین وشریعت کے لیے آپ تازہ دم اور اسلام دشمن افراد سے پنجہ آزمائی کے لیے مستعد وتیار ہیں اور شاہراہِ خدمت پر آگے، بہت آگے بڑھتے جارہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ آنے والے دَور میں ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت اور اس ملک میں دین وشریعت کے تحفظ کے لیے ''تازہ دم سپاہ'' تیار کرنے میں مشغول ہیں۔

حضرت مدظلہٗ کی ذاتِ گرامی اوصاف وخصوصیات کی جامع ہے۔ آپ صرف دور اندیش قائد، زبردست عالمِ دین، صاحب قلم انشاء پرداز، بے باک خطیب، کامیاب منتظم ہی نہیں؛ بلکہ ملکی قانون کے زبردست ماہر، صاحبِ بصیرت سیاستداں اور عصری علوم کے بہترین واقف کار ہیں؛ اسی لیے آپ خانقاہِ رحمانی کے سجادہ نشین، جامعہ رحمانی کے سرپرست اعلیٰ وروحِ رواں، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سکریٹری، امارتِ شرعیہ بہار واُڑیسہ کے نائب امیر شریعت، اور آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے نائب صدر ہونے کے ساتھ ساتھ مرکزی حکومت کی مدرسہ ماڈرانائزیشن کمیٹی کے چیئرمین، رحمانی تھرٹی کے سربراہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر، اور رحمانی فاؤنڈیشن کے بانی بھی ہیں اور ماضی میں حکومت بہار کے ایم ایل سی اور قانون ساز اسمبلی کے ڈپٹی چیئرمین رہ چکے ہیں۔ قدیم نافع اور جدید صالح کا ایسا امتزاج، علومِ دینیہ وعلومِ عصریہ کی ایسی جامعیت، روحانیت وسیاست کا ایسا اجتماع، صرف آپ ہی کی شخصیت کا امتیاز ہے۔ شعروادب کی زبان مستعار لی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی اس مرصع غزل کے مانند ہے جس کا ہر شعر دوسرے شعر سے الگ؛ مگر اپنی جگہ معنی خیز ہوتا ہے۔

رحمانی فاؤنڈیشن کا قیام آپ کا قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔ کمپیوٹر کی معیاری تعلیم کے فروغ، اور غریبوں کے علاج کی زبردست خدمت یہاں سے انجام دی جارہی ہے۔ فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام آنکھوں کے مفت آپریشن

کیمپ اور لینس کیمپ کا نظام جاری ہے۔ اور اب تک ہزاروں غریب اور مستحق افراد فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام جاری شعبۂ صحت سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ رحمانی فاؤنڈیشن ایک دیدہ زیب، جاذب نظر، اور طویل وعریض عمارت میں قائم ہے اور مسلسل شاہراہِ ترقی پر گامزن!

رحمانی فاؤنڈیشن ہی کے ماتحت چلنے والا ایک فعال اور خدمت گزار ادارہ رحمانی تھرٹی ہے۔ جہاں مسلم طلبہ کو آئی آئی ٹی کی مفت تیاری کی جاتی ہے۔ یہ ادارہ اس ذہن کے ساتھ قائم کیا گیا ہے کہ مسلمان طلبہ کو اگر سازگار ماحول اور مناسب وسائل مہیا کیے جائیں تو وہ بھی تعلیمی میدان میں اپنی صلاحیت وقابلیت کا لوہا منوا سکتے ہیں۔ مئی ۲۰۰۹ء میں جب رحمانی تھرٹی کے زیر اہتمام آئی آئی ٹی کی تیاری کرنے والے دس مسلمان طلبہ نے (جو متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں) مقابلہ جاتی امتحان میں حصہ لیا اور دس کے دس طلبہ نے آئی آئی ٹی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تو پورا ملک چونک پڑا۔ اخبارات ورسائل میں بڑے پیمانے پر اس کی تشہیر ہوئی، استقبالیہ جلسے منعقد ہوئے، اور حضرت مولانا کی اس عظیم خدمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ لوگوں نے اس سچائی کو بھی قبول کیا کہ ''مسلمان طلبہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور تعلیمی میدان میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔ صرف وسائل اور مواقع کی فراہمی کی انھیں ضرورت ہے۔'' اس سال بھی پٹنہ میں آئی آئی ٹی کی فری کوچنگ جاری ہے، اور یہ اطلاع بھی بڑی حوصلہ افزا اور خوش کن ہے کہ اورنگ آباد میں بھی رحمانی اکیڈمی قائم ہو چکی ہے اور تقریباً دو سال سے آئی آئی ٹی کی فری کوچنگ کا سلسلہ جاری ہے۔ قوی امید ہے کہ اس کے بہتر اور مفید نتائج سامنے آئیں گے۔ اس سلسلہ کو پورے ملک میں پھیلانے کا عزم مخلص کارکنوں کے دل میں موجود ہے۔ اللہ کرے کہ یہ سلسلہ دُور رَس اثرات کا حامل ثابت ہو۔

ہمارے حضرت کی سب سے بنیادی حیثیت بافیض مرشد اور صاحب نسبت بزرگ کی ہے۔ طویل عرصے سے آپ اصلاح وارشاد کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں اب تک تقریباً پانچ لاکھ اللہ کے بندے بندیاں آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر چکے ہیں۔ آپ کے ذریعہ خانقاہ رحمانی کا فیض پورے ملک کے گوشے گوشے میں پہونچ رہا ہے۔ بندگانِ خدا جوق در جوق خانقاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور بزرگانِ سلسلہ کی توجہات اور آپ کی روحانیت سے مستفیض ہوتے ہیں۔ ماہانہ مجلس درود شریف کے موقعہ پر بڑی تعداد میں مختلف علاقوں کے افراد شرف بیعت حاصل کرنے کے لیے خانقاہ آتے ہیں اور یہ سلسلہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔

دوسری اور خوبیوں سے قطع نظر ان کی ایک بڑی خوبی ان کی خطیبانہ صلاحیت ہے۔ وہ بولتے نہیں موتی رولتے ہیں۔ وہ چاہے علماء کے مجمع میں بولیں یا جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کی مجلس میں، ہر جگہ اپنی صلاحیت کا لوہا منوا لیتے ہیں۔ مشاہدہ کی غیر معمولی قوت، مطالعہ کی وسعت، اور ذہانت وذکاوت کی فطری صلاحیت نے ان کی

تقریروں کو ''إن من البیان لسحرا'' کے زمرہ میں شامل کردیا ہے۔لہجہ کا اُتار چڑھاؤ اور الفاظ کا حسنِ انتخاب بھی ان کے خطبات کو غیر معمولی حسن بخشتا ہے۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان کی تقریر کا انداز، اور لب ولہجہ یہ ہے!

''ہاں! ایک بڑی سادہ سی حقیقت ہے، اسے بھی گرہ باندھیے..... قطرہ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے اپنے وجود کو باقی رکھنے کا..... اور موج کے لیے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ خدا نے دوسرے بہت سے وجود کو اس کے زیر اثر کر رکھا ہے اور اس کا وجود نہتوں کے لیے پیغامِ زندگی ہے.....؛ اس لیے برادارانِ محترم! میری بڑے ادب کے ساتھ آپ سے گزارش ہے، کہ آپ موج کا ایک قطرہ نہ بنیں، علیحدہ علیحدہ قطرہ بن کر جینا نہ آپ کی نفع رسانی کو بڑھا سکتا ہے، نہ خدمت کو مؤثر کرسکتا ہے اور نہ کسی بڑے اقدام کو حوصلہ بخش سکتا ہے۔''

وہ صرف مقرر اور خطیب ہی نہیں مایۂ ناز ادیب اور منفرد طرز کے انشاء پرداز بھی ہیں۔اُن کی تحریریں بڑی موثر، بڑی جاندار اور دلائل سے آراستہ پیراستہ ہوتی ہیں، سادہ؛ مگر پُر اثر، عام فہم اور دل میں اتر جانے والی اور ذہنوں کو اپیل کرنے والی تحریر اُن کا امتیاز ہے۔اور معلومات ودلائل کے ساتھ سادگی و بے ساختگی اُن کی تحریر کا خاصہ ہے۔ میں جب بھی اُن کی کوئی تحریر پڑھتا ہوں تو دل ہی دل میں دعا کرتا ہوں کہ تحریر طویل ہوتا کہ لذتِ تحریر سے دیر تک محظوظ ہوسکوں اور جب تحریر ختم ہوجاتی ہے تو دوبارہ، سہ بارہ پڑھتا ہوں اور الفاظ کو ذہن میں بسانے اور دل میں سجانے کی کوشش کرتا ہوں۔آپ کی گراں قدر تصانیف میں ''بیعت عہد نبوی میں''، ''شہنشاہِ کونین کے دربار میں''، ''تصوف اور حضرت شاہ ولی اللہ''، ''یادوں کا کارواں''، ''چند لمحے یاد کے تاباں''، ''درخشاں جاوداں'' قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ چند قانونی مسائل پر آپ کے گراں قدر رسالے بڑی تعداد میں چھپ کر افادۂ عام کا باعث ہوئے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مشاغل کی کثرت اور وقت کی قلت نے انھیں زیادہ لکھنے کا موقع نہیں دیا؛ مگر جو بھی لکھا، خوب لکھا، ان کی کتابیں، ان کے رسائل اور ان کی تحریریں بڑی دلکش، ادیبانہ اور ذہن ودل میں اُتر جانے والی ہیں۔

بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے سایہ کو ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے، آمین یارب العالمین۔

تذکرۂ اولیاء

# ہمارے مخدوم جوارِ رحمت میں

## حضرت اقدس سعید الملّت مفتی سعید احمد صاحب قدس سرہٗ

### خلیفہ حضرت محی السنہ مولانا شاہ ابرالحق صاحب حقی قدس سرہٗ

ترتیب: مولانا محمد اویس صاحب رشادی، استاذ دارالعلوم شاہ ولی اللہ بنگلور

## ہمارے مخدوم کی نسبتیں

### اللہ والوں کا شہر:

جنوبی ہند کا ایک زرخیز قصبہ پرنامبٹ، جس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ شہر اللہ والوں کے شہر سے جانا پہچانا جاتا ہے، جس کی گود میں بہت سے اہل اللہ صاحبِ نسبت نے پرورش پائی، جس کی فضاؤں اور ہواؤں کو بہت سے خداترس بزرگوں سے بغل گیر ہونے کا شرف ملا ہے، وفات پانے والے بزرگوں میں حضرت قاضی بشیرالدین المعروف بہ بڑے حضرت، مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے تربیت یافتہ حضرت فقیہ ملت مولانا مفتی محمود حسن قدس سرہٗ، حضرت مدنی اور مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب کے شاگرد فاضل دیوبند حضرت مولانا نثار صاحب قاسمی قدس سرہٗ، حضرت شاہ فضل الرحیم صاحب قدس سرہٗ، حضرت شاہ مسیح اللہ خان صاحب کے خلیفہ حاذق الامت حضرت مولانا حکیم زکی الدین صاحب قدس سرہٗ، حضرت مولانا محمد ایوب رحمہ اللہ، حضرت مولانا ذاکر رحیمی رحمۃ اللہ علیہ اور آخرالذکر ہم سب کے مخدوم ومربی جانشین فقیہ ملت حضرت محی السنہ کے خلیفہ سعید الملّت حضرت مولانا مفتی سعید احمد برداللہ مضجعہٗ ہیں۔

### قاضی خاندان کا اَنمول موتی:

برسوں پہلے ایک خالص علمی خاندان آرکاٹ نواب کی دعوت پر مسند قضا سنبھالنے بیجاپور سے پرنامبٹ منتقل ہوگیا تھا، جو قاضی خاندان سے مشہور ہے، ہمارے مخدوم اسی علمی خانوادہ کے چشم وچراغ ہیں، ماضی بید میں ان

کے آبائی واجداد کے کارنامے مسلم تھے، ہر ایک کو اپنی جگہ مرکزیت حاصل تھی، انھیں اکابر کے فیوض و برکات کے حامل ہوکر آپ اس علمی خانوادہ کے سلسلہ کے بے مثال جوہر اور انمول موتی قرار پائے، گویا آبائی واجداد کی روحانی نسبتوں کا ایک بڑا حصہ آپ کے نصیبہ میں قدرت نے مقدر فرمادیا ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ.

جنوبی ہندوستان کے ایک بڑے طبقے (علماء، عمائدین، تجار، ملازمین، مزدور) نے آپ کو اپنا بڑا تسلیم کرلیا، کوئی شیخ کی نظر سے تو کوئی مشیر و محسن کی نظر سے، کوئی صاحبِ برکت کی نظر سے تو کوئی رہبر امت کی نظر سے آپ کو دیکھتا اور زیارت کے ذریعہ اپنی نظروں کو ٹھنڈا کرتا تھا۔

## سلسلہ اشرفیہ کی کڑی کا ایک ہیرا:

جس گھرانے میں آپ نے پرورش پائی اور جس خانوادہ کے آپ سپوت تھے وہاں اکابر دیوبند کا نہ ختم ہونے والا تذکرہ ہمیشہ کانوں سے ٹکراتا تھا، خود اپنے والد ماجد کو حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ اور حضرت شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے منسلک پایا، والد ماجد کے وصال کے بعد سب کچھ حاصل ہوجانے کے باوجود آپ کے دل میں بھی اس سلسلہ کی کڑی سے جُڑ جانے کا داعیہ پیدا ہوا، اس غرض کی تکمیل کے لیے آپ نے اس وقت کے یکتا موتی حضرت تھانوی کے خلیفہ اجل محی السنہ حضرت شاہ ابرار الحق صاحب حقی قدس سرہٗ سے اپنے آپ کو وابستہ کرلیا، وحدت مطلب میں کمال پیدا کرکے آخری زندگی تک انھیں کے ہوکر رہے، جب بھی حضرت کا تذکرہ آتا یا آپ اپنے مواعظ میں اپنے شیخ کا تذکرہ فرماتے، نام لینے کے بجائے فرماتے ہمارے حضرت، ہمارے حضرت اور حضرت محی السنہ بھی اپنے اس خدا ترس عقیدت مند سے والہانہ محبت فرماتے تھے، حضرت محی السنہ نے اپنی باطنی نسبت کا ایک وافر حصہ آپ میں منتقل فرما کر اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا، ہمارے مخدوم کی بے شمار خوبیوں پر گویا حضرت محی السنہ نے مہر نسبت ثبت فرمادیا، جس سے ایک گونہ آپ کی جاذبیت میں اضافہ ہوگیا، تسہیل قصد السبیل میں پیر کامل کی جو پہچان بتائی گئی ہے ساری علامتیں آپ میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں، وہ پہچان یہ ہیں:

(۱) ضرورت کے موافق دین کا علم اس کو ہو۔
(۲) عقیدے اور عمل اور عادتیں اس کے شروع کے موافق ہوں۔
(۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو، کامل ہونے کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی دنیا کی شاخ ہے۔
(۴) کسی کامل پیر کے پاس کچھ دن رہا ہو۔
(۵) اس کے زمانے میں جو عالم اور درویش منصف مزاج ہوں وہ اس کو اچھا جانتے ہوں۔
(۶) عام لوگوں کی نسبت خاص لوگ یعنی جو سمجھدار اور دیندار ہوں وہ اس کے معتقد ہوں۔

(۷) اس کے مریدوں میں اکثر مرید شرع کے پابند ہوں اور ان کو دنیا کی طمع نہ ہو۔

(۸) وہ اپنے مریدوں کی تعلیم جی سے کرتا ہو اور چاہتا ہو کہ یہ درست ہو جائیں اور اگر مریدوں کی کوئی بُری بات دیکھتا ہو یا سنتا ہو تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو، یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔

(۹) اس کے پاس چند دن بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور اللہ کی محبت میں زیادتی معلوم ہوتی ہو۔

(۱۰) خود بھی وہ ذکر و شغل کرتا ہو۔ (خلاصہ تسہیل قصد السبیل: ص/۲۲)

حقیقی خدام منصف مزاج متوسلین اور فطرتِ سلیم کے حامل متعلقین جانتے ہیں کہ حضرت اقدس ان حوبیوں کے جامع تھے، منصب مشیخت کے آپ بلاشبہ حقدار تھے، جو ملا آپ کو دربارِ ایزدی سے ملا، سلسلہ اشرفیہ کی نسبتیں ملیں، محی السنہ کی برکتیں ملیں، اللہ آپ کے فیوض کو سدا بہار رکھے، آمین۔

## بڑوں کا اعتماد

### معتمد علیہ شخصیت:

جس طرح ہمارے مخدوم اپنے چھوٹوں میں مقبول تھے اسی طرح؛ بلکہ اس سے کہیں زیادہ آپ کو اپنے بڑوں کا اعتماد حاصل رہا، عمر کا تیسواں سال چل رہا تھا، والد بزرگوار کا وصال ہو گیا، عمائدین شہر کی نظر آپ پر ٹکی اور آپ کو والد بزرگوار کی جگہ لا کر بٹھا دیا گیا، مدرسہ عربیہ وصیۃ العلوم کی سرپرستی وصدارت سونپ دی گئی، والد ماجد فقیہ ملت مفتی محمود حسن قدس سرہٗ کی جگہ منصب افتاء کے لیے آپ ہی سب سے زیادہ موزوں قرار پائے اور مسند ارشاد پر قدرت نے آپ کو متعین فرما دیا، ان خدمات پر مامور و متعین ہوتے وقت تین بزرگ چچا (نثار حضرت، شاہ فضل الرحیم حضرت اور عزیز حضرت) باحیات تھے، ان خداترس بزرگ چچاؤں کی شفقت بھی آپ کو ملی اور لمبا زمانہ مدرسہ کے انتظام وانصرام میں چچازاد بھائی اور چھوٹے بہنوئی حضرت مولانا ذاکر رحیمی صاحب قدس سرہٗ کی رفاقت بھی حاصل رہی، بلاشبہ دونوں بھائیوں کا خلوص وللّٰہیت؛ بلکہ کرامت اور بڑوں کی تربیت وتوجہ کا اثر ہی تھا کہ دونوں قریب قریب ایک عمر ہونے کے باوجود جس ملنساری سے کام کو آگے بڑھاتے گئے ایک دوسرے کے مزاج ومذاق کا لحاظ کرتے ہوئے اکابر کے لگائے ہوئے پودے کی حفاظت میں لگے رہے، یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ہر ایک نے دوسرے کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اپنا محسن اور کام میں اپنا معاون جانا۔

ایسے عظیم المرتبت مناصب کسی کسی کو پیرانہ سالی میں عمر کے آخری حصے میں ملا کرتے ہیں؛ مگر ہمارے مخدوم کے حق میں عین شباب کے زمانے میں حق تعالیٰ نے مقدر فرما دی، قدرت کی طرف سے بھرپور تائید ونصرت بھی

حاصل تھی، نصف عمر سے زیادہ ان خدمات کو بحسن وخوبی نبھایا، یہ سب بڑوں کی طرف سے اعتماد کے بغیر نہیں ہوسکتا، اس سے بڑھ کر یہ عنداللہ مقبولیت کی دلیل بھی ہے۔

أُولَـئِکَ آبَـائِيْ فَجِئْنِيْ بِمِثْلِهِمْ
إِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيْرُ الْجَامِعُ

## منصبِ امامت اور استقامت:

سطور بالا سے یہ معلوم ہوا کہ ہمارے مخدوم کے والد ماجد فقیہ ملت کے انتقال کے وقت آپ کی عمر صرف تیس سال تھی، انتقال کے اگلے دن ہی ذمہ داروں نے آپ کو امامت کے مصلیٰ پر کھڑا کردیا (ہمارے مخدوم کو جو خدمت بھی ملی من جانب اللہ ملی، کبھی کوئی عہدہ ومنصب کے طالب ہوئے نہ اپنے آپ کو اس کا اہل جانا) اس دن سے لے کر وفات سے دوڈھائی سال قبل تک چالیس سال سے زیادہ عرصہ اس ذمہ داری کو پوری پابندی واستقامت کے ساتھ بحسن وخوبی نبھایا، آواز میں کشش، دل کو موہ لینے والا لہجہ، سنت کے مطابق قرأت، تلاوت میں ترتیل، اس سے بڑھ کر کونسی کرامت ہوسکتی ہے **الاستقامة فوق الكرامة**.

## کم عمری میں ولایت:

جیسا کہ سطور بالا سے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ ہمارے مخدوم دَورِ جوانی سے دین کی ہمہ جہت خدمات میں لگ گئے تھے، مسندِ ارشاد کے رونق بن چکے تھے، صاحبِ نسبت ہوگئے تھے، یہ سب اللہ ہی کے فضل کا حصہ تھا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مجھے اس وقت میرے مشفق مربی حضرت مولانا محمد ولی اللہ صاحب رشادی قدس سرہٗ (سابق مہتمم معدن العلوم وانمباڑی) کی بات یاد آرہی ہے، میری شادی کی شروعات میں ہمارے مخدوم کا سفر بنگلور طے ہوا، راستہ میں وانمباڑی ہوتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لینا تھا، جب ولی اللہ حضرت کو اطلاع ہوئی کہ سعید حضرت معدن العلوم تک پہنچ کر مجھے ساتھ لے کر بنگلور جانے والے ہیں تو حضرت نے مجھ سے کہا مولانا! سعید حضرت سے مدرسہ آنے کی درخواست کرو؛ کیونکہ محمود حضرت معدن سے فارغ ہیں؛ اس لیے آپ کا آنا حق بنتا ہے، بہرحال میں نے درخواست رکھ دی، حضرت نے قبول فرمالیا، ہم سب آپ کی آمد کے انتظار میں تھے، اس وقت ولی اللہ حضرت نے مجھ سے کہا کہ: ''مولانا! سعید حضرت مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں، چھوٹی عمر میں بزرگ بن گئے ہیں''۔

## آپ کا فتویٰ حرفِ آخر:

والد ماجد فقیہ ملّت مفتی محمود حسن قدس سرہٗ اور چچا جان حضرت مولانا مفتی نثار احمد قاسمی علیہ الرحمہ وغیرہ سے آپ کو شرفِ تلمذ حاصل رہا، انھیں کی تربیت میں آپ نے فتویٰ نویسی کی خوب مشق کی اور آپ کو اس فن میں حد درجہ ممارست ہوئی اور دُور دراز سے سوالات موصول ہوتے، ان کا آپ بڑے ہی سہل عام فہم انداز میں جواب مرحمت فرماتے کہ سائل مطمئن ہوجاتا اور شرعی حل سے بہرہ ور ہوجاتا، آپ سے فتویٰ لینے کے بعد مزید اطمینان کے لیے کسی اور جگہ رجوع ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی، گویا اس کے نزدیک آپ ہی کا فتویٰ حرفِ آخر ہوتا، آپ کا فتویٰ شریعت کے مزاج سے بالکل ہم آہنگ ہوتا، جہاں شریعت کی طرف سے وسعت وگنجائش کی راہ نظر آتی مستفتی کو اس راہ کی طرف رہبر فرمادیتے تھے۔

# حقوق کی پاسداری

## والدین کی خدمت میں:

تیس برس تک والد ماجد کا سایہ انھیں نصیب ہوا، ساٹھ برس سے زیادہ عمر تک والدہ ماجدہ کی شفقتیں انھیں ملیں، والد صاحب کے سامنے ان کی اور ان کے بھائی حضرت مولانا اسعد احمد صاحب دامت برکاتہم کی حاضری ایسی ہوتی تھی جیسے ایک غلام آقا کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے، اسی طرح والدہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، سر جھکائے ہوئے بغور ان کی باتیں سماعت فرماتے، حکم کی تعمیل فرماتے تھے، ان کے حسنِ سلوک سے آیت کی تشریح وتفسیر سمجھ میں آتی تھی:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴾ (اسراء:۲۳)

''اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے پاس بُڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اُف تک نہ کہو اور نہ اُنھیں جھڑکو؛ بلکہ ان سے عزت کے ساتھ بات کیا کرو''۔

اللہ ہر والدین کو ایسی اولاد نصیب فرمائے، آمین۔

## بھائی بہنوں کے حقوق:

ہمارے مخدوم کے ایک بزرگ برادر اور تین بہنیں ہیں، ایک چھوٹی بہن جو حضرت مولانا ذاکر رحیمی

صاحب قدس سرہٗ کی اہلیہ محترمہ تھیں، جن کا وصال ہو چکا ہے، اللہ غریقِ رحمت فرمائے، ساری زندگی ہمارے مخدوم نے ان کے حقوق کا خیال رکھا، اپنے چھوٹے بھائی (حضرت مولانا اسعد احمد صاحب دامت برکاتہم خلیفہ حضرت محی السنہ قدس سرہٗ) کے ساتھ شفقت کا معاملہ تھا، آپ بھی اپنے برادر معظم کے پاس خادمانہ حیثیت سے حاضر ہوتے، یہ سب اخلاص وللّٰہیت کی صریح نشانیاں ہیں۔

## اولاد کی تربیت:

اللہ نے حضرتا قدس کو پانچ اولاد عطا فرمائیں، دو بیٹے اور تین بیٹیاں، آپ نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو حافظ، عالم، مفتی بنایا، بجا طور پر دونوں حضرت کے جانشین بننے کے لائق ہیں، حضرت ہی کی تربیت کا اثر ہے پانچوں اولاد ایک مزاج اور ایک ذوق کے حامل ہیں اور اپنے ماں باپ کے قدردان اور شکر گزار اور ہر وقت ان کی راحت وآرام کا خیال رکھنے والے ہیں، یہ سب ماں باپ کی توجہ وتربیت کے بغیر پیدا نہیں ہو جاتی۔

ایک اور دولت بھی آپ کے نصیبہ میں آئی، چنانچہ:

**عن أبي هريرة رضي اللّٰه عنه: أن النبي صلّى اللّٰه عليه وسلم قال: إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثةٍ: إلا من صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أوولد صالح يدعو له.** (رواه مسلم)

اِس حدیث پاک میں جن تین اعمال کا ثواب وفات کے بعد بھی ملنے کی بشارت دی جارہی ہے وہ تینوں دولت (علمِ نافع، صدقۂ جاریہ، نیک اولاد) آپ کے اعمال نامہ میں جمع ہیں۔ (۱) علم نافع کی وافر مقدار فتاویٰ وارشادات کی شکل میں آپ نے چھوڑا ہے۔

(۲) جتنے منتسبین اور متوسلین آپ سے منسلک ہوئے ان کی اصلاح ہوئی، تازیست وہ عمل کرتے رہیں گے، وہ ان کے لیے صدقۂ جاریہ رہے گا۔

(۳) پانچوں اولاد نیک طینت، سلیم الفطرت ہیں، حیات میں بھی اور وفات کے بعد بھی دعا گو رہنے والی اولاد آپ کو ملی ہے۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ

## بیٹیوں سے والہانہ محبت:

**عن أنس بن مالك قال: قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم: من عال جاريتين دخلت أنا وهو الجنة كهاتين اوأشار بأصبعيه.** (سنن الترمذی)

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے دولڑکیوں کی پرورش کی میں اور وہ دونوں جنت میں اس طرح داخل ہوں گے (یہ فرماتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں اُنگلیوں کو ملا کر اشارہ فرمایا''۔

**عن ابن عباس قال: قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: مامن رجل تدرک لہ ابنتان فیحسن إلیھما، ماصحبتاہ أو صحبھما إلا أدخلتاہ الجنۃ.** (سنن ابنِ ماجہ:٣٦٧٠)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے پاس دولڑکیاں ہوں اور وہ اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے جب تک کہ وہ دونوں اس کے ساتھ رہیں، یا وہ ان دونوں کے ساتھ رہے تو وہ دونوں لڑکیاں اسے جنت میں پہنچائیں گی''۔

اِن گراں قدر ہدایاتِ نبویؐ کے پیشِ نظر حضرت اقدس نے اپنی بیٹیوں کا خوب خیال رکھا، بیاہ دینے کے بعد بھی طلب کر کے ان کو بلاتے، اصرار کے ساتھ ان کو اپنے پاس روکتے، کبھی لینے سفر کی مشقت برداشت کر کے پرنامبٹ سے بنگلور پہنچتے، تو کبھی خود واپس پہنچانے سفر فرماتے، اولاد کی تربیت میں مساوات کے ساتھ قلبی میلان اور جھکاؤ بچیوں کی طرف زیادہ رہا، یہ شفقت صرف بچیوں تک ہی نہیں، اس سے بڑھ کر اپنے بچوں کی اولاد سے بھی ساری زندگی والہانہ محبت اور خاص توجہ کا معاملہ فرمایا۔

❑❖❑

تذکرۂ اولیاء

# رہ گئی تھی اِک شمع سو وہ بھی خموش

## عارف باللہ حضرت مولانا سید مکرم سنسار پوریؒ

ازقلم: مولانا نجم الدین صاحب انبہٹوی، ترجمان خانقاہ عظیمیہ و مدرسہ خلیلیہ انبہٹہ پیر سہارنپور

اس عالمِ رنگ و بو میں باری تعالیٰ نے اپنی بے پایاں حکمتوں اور مصلحتوں اور نظامِ دنیا چلانے کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تراش خراش، بناؤ سنگار، اُتار چڑھاؤ اور اس کی بقا و ارتقاء کے لیے رحلت و ارتحال اور ارسال و ترسیل کا عمل رکھا ہوا ہے، اور بات بھی اربابِ عقل و فکر سے مخفی نہیں ہے کہ یہ خدائی عمل انسانوں کے مفادات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہے؛ کیوں کہ یہ دنیا وجود میں لائی ہی گئی ہے اس میں انسانیت کو بسانے آباد کرنے اور اس کے ذریعہ چہل پہل کرنے کے لیے؛ تاکہ خداوندِ قدوس اپنی رعنائی، انفرادیت اور وحدت کے جلوے بکھیر سکے اور اپنی معبودیت کے مظاہرے کر سکے؛ اسی لیے باری تعالیٰ ہر دَور میں ایسی ایسی شخصیتیں پیدا کرتا رہا ہے جو اس کے مقاصد کی تکمیل میں نہ صرف خود امتثال کر کے نشانِ امتیاز حاصل کریں؛ بلکہ دوسروں کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں، ہر دو اعتبار سے اپنے رب کا قرب و تقرب کے مقامات طے کریں، یہی لوگ ہوتے ہیں گل سرسبد کا مقام حاصل کر لیتے ہیں اور کچھ تو قوس و قزح جیسی خوبیوں اور دل کشی کے مالک ہو جاتے ہیں، ایسی شخصیات میں ایک نیک نام پیر طریقت، شیخ کامل، عارف باللہ حضرت مولانا سید مکرم حسین صاحب سنسار پوریؒ کا بھی ہے۔ محفل شریعت و طریقت کا وہ چراغِ سحر کئی سالوں سے ضعفِ مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا، بالآخر ۲۲/ذی الحجہ ۱۴۴۴ھ بروز جمعہ کو ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

یقیناً حضرت علیہ الرحمہ ان زعمائے قوم اور خدامِ دین میں سے تھے کہ ان سا کوئی فرد اب چراغ رخِ زیبا لے کر ڈھونڈ پانا بھی ناممکن اگر نہیں تو مشکل ضرور محسوس ہوتا ہے۔ علم و عمل، فضل و کمال، ایمانِ معرفت، زہد و ورع وہ مہر تاباں غروب ہو گیا، جس کی ضیاء سے نصف صدی سے زائد عرصہ تک ایک عالم منور ہو رہا تھا وہ چشمۂ تزکیہ و ہدایت خشک ہو گیا، جس سے ایک دنیا سیراب ہوئی، راہِ طریقت کا یہ مسافر جس کا نام سن کر دل میں عظمت و محبت کی دنیا آباد ہو جاتی تھی، اپنی منزل کو پہنچ گیا۔

آپ کی ولادت ۱۹۳۳ء میں سہارنپور کی ایک زرخیز بستی قصبہ ''سنسار پور'' حضرت مولانا حکیم سید اسحاق صاحبؒ کے گھر میں ہوئی، جو خود حکیم الامت حضرت اقدس تھانویؒ اور قطبِ عالم حضرت رائپوریؒ کے مجاز تھے، اور حضرت کے دادا محترم ڈاکٹر سید حسن صاحب مرحوم دارالعلوم دیوبند کے کبار علماء کی انقلاب آفریں صحبتوں سے فیض یاب تھے، اسی طرح آپ کے جدامجد حضرت صوفی سید کرم حسین صاحب اور حضرت مولانا حکیم سید فیض الحسن صاحب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے کبار خلفاء میں سے تھے۔

یہ معلوم ہے کہ انسان جو اپنی ذات وصفات کے عنوان سے دراصل اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے وہ کن حالات اور ماحول میں پیدا ہوتا ہے، کس چمنستان رنگ وبو سے اس کے مشام جاں آشنا ہوتے ہیں، پھر وقت کے ساتھ وہ نشو ونما پاتا ہے اور یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، کہ شخصیتوں کی تعمیر میں والدین کا کلیدی کردار ہونا بچپن کی پرورش وپرداخت ہی اس بچہ کے لیے سمت کا تعین کرتی ہے۔

حضرت سنسار پوریؒ کو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں چیزوں سے مالا مال فرمایا تھا، آپ نے نادرۂ روزگار شخصیات کے ہم آغوش ہوکر تعلیمی وتربیتی سفر کا آغاز فرمایا۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ فیض رحمانی سنسار پور میں حاصل کی، تکمیلِ حفظِ قرآن کے بعد والدِ محترم سے درسِ نظامی کی کتابیں شرح جامی تک پڑھیں، بعدازاں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے، جہاں اصحابِ فضل وکمال کا بسیرا تھا، اقطاعِ عالم کا نشہ کامان علم وفکر یہاں آکر اپنا دامن مراد بھر رہے تھے۔

چنانچہ حضرت المرحوم نے بقدر ظرف ووسعت یہاں کے باکمال اساتذہ ومحدثین کے خوان یغما میں خوشہ چینی کی؛ نیز ان کی شریعت وسنت سے عبارت پاکیزہ زندگی کے قابلِ قبول اوصاف کو اپنا لینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ۱۳۶۹ھ ۱۹۴۹ء میں فاتحۂ فراغ پڑھی تعلیمی مراحل طے کرکے روحانیت کے سمندر میں غوطہ زنی شروع کردی اور قطب الارشاد حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری سے بیعت وارادت کا رشتہ استوار کیا۔ صلاح وتقویٰ پہلے سے ہی سے تھا اب جو حضرت رائپوری کا دستِ شفقت اور سایۂ عاطفت نصیب ہوا تو یہ اوصاف مزید نمایاں ہوئے، ان کے روحانی سفر کے رفیق جدامجد حضرت مولانا عظیم الدین صاحب انبہٹویؒ فرماتے تھے کہ مولانا سنسار پوری پر حضرت رائپوری کی خاص توجہات تھیں، جو مجھے اچھی طرح محسوس ہوتی تھیں، بہت حسنِ اسلوبی سے سلوک کے مراحل طے کرلیے اور اجازتِ بیعت سے نوازے گئے۔

اس کے بعد وہ اسلاف کی گراں مایہ امانت کو نسلِ نو میں محفوظ منتقلی کے لیے کوشاں ہوگئے، ساتھ ساتھ اپنے خاندانی پیشۂ طب سے بھی وابستہ رہے؛ لیکن اس پیشے سے کبھی آپ نے زرکشی کو مقصد نہیں بنایا، آپ روحانی

وجسمانی مریضوں کو دوائی دیتے تھے، افسردہ دلوں میں عشقِ الٰہی کی انگیٹھی سلگاتے رہے۔ ان کا روحانی مقام کیا تھا؟ تو اہلِ معرفت ہی بتا سکتے ہیں وہ غوث وقطبیت کے کس مقام پر فائز تھے؛ لیکن جس طرح انھوں نے سلوک ومعرفت کے جام لنڈھائے، گم کردہ راہوں کو جادۂ مستقیم پر گامزن کیا اور ایمان باللہ کی حقیقی لذت سے اس کے نام لیواؤں کو آشنا کیا، اس سے تو واقعی خیر القرون کی یاد تازہ سی ضرور ہوگی۔

راقم کو ان کی زیارت کا بارہا اتفاق ہوا، ایک مرتبہ جدامجد حضرت مولانا عظیم الدین انہٹویؒ کے پاس بھی تشریف لائے تھے، اس وقت بچپن تھا، بے شعوری کا یہ عالم تھا کہ نہ آنے والوں سے مطلب نہ جانے والوں کا پتہ؛ لیکن حضرت سنسار پوری کی نورانی پرکشش صورت اور مقناطیسی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، یہ زیارت پہلی مرتبہ ہوئی تھی، پھر کافی دنوں تک سوچتا رہا کہ اب یہ حضرت پتہ نہیں کب آئیں گے، کافی دن انتظار کے بعد ایک بار موقع لگا کہ حضرت جدامجد سے کہہ ہی ڈالا کہ سنسار پور والے حضرت کیوں نہیں آئے؟ جدامجد نے فرمایا کہ انہیں وقت اتنا کہاں وہ ہماری قسمت تھی وہ اس طرح اچانک تشریف لے آئے تھے، راقم نے کہا پھر مجھے ان کے پاس جانا چاہے، دو تین روز کے بعد حضرت جدامجد اپنے ساتھ لے گئے، یہ ساری بات بتائی حضرت بہت مسرور ہوئے اور دعائیں دیں۔ حضرت سانحۂ ارتحال کے بعد والد محترم مولانا معین الدین صاحب انہٹوی کے ساتھ بھی جانا ہوتا رہا، پہلی ہی زیارت نے ان کی عقیدت کا سکہ دل پر جما دیا تھا، ان کی باوقار شخصیت نے راقم کو آہن پاروں کی طرح اپنے کمالات کا اسیر بنا کر ہی چھوڑا تھا۔

بہرحال ان کی وفات کی خبر پاتے ہی والد محترم حضرت مولانا معین الدین صاحب نے مجلسِ ایصالِ ثواب کا اہتمام فرمایا اور ایک تعزیتی خط ان کے حفید ذی احترام اور جانشین حضرت مولانا مفتی عزیر صاحب مدظلہٗ کے نام مہر کر کے روانہ کیا، آج جبکہ ان کی جدائی پر راقم کی طرح بہت سے لوگ قلم کے آنسوں بہا رہے ہیں، وہ اپنے حسنِ عمل، طہارتِ قلب ونظر کے ساتھ ایمان ویقین کی روشنی بکھیر کر ہزاروں بندگانِ خدا کو فیض یاب کر کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے؛ لیکن ان کے آثارِ علمیہ وعملیہ اور نقوش تابندہ بہت دیر اور دُور تک رہیں گے، اللہ تعالیٰ حضرت کو اعلیٰ علیّین میں جگہ مرحمت فرمائیں اور ہم سب کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے والا بنائے، آمین۔